تمہید

چند سال ہوئے کہ خادم کا ایک رسالہ بنام خدا کی بابت مسیحی دین کی تعلیم شائع ہوا۔ کتاب ہذا اُسی کا دوسرا حصہ ہے۔ میں اپنے معزز دوست پادری عمانوئیل صادق صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے نظرِ ثانی کرکے چند غلطیوں کی اصلاح کی ۔

خادم کی دُعا ہے کہ یہ رسالہ ناظرین کے لئے مفید ثابت ہو۔آمین۔

ولیم میچین

فیض آباد۔۱۱جولائی ۱۹۵۲

فہرستِ مضامین

انسان کی بابت مسیحی دین کی تعلیم

باب اوّل

انسانی فطرت

انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے اورکدھر جاتا ہے؟اس کا کیا حال ہے اورکیا ہونا چاہیے ؟انسان کا کیا حشر ہوگا؟انہیں سوالوں کا جواب دینا اور مسیحی دین کی تعلیم کے موافق جواب دینا اس رسالہ کا مقصد ہے۔کیونکہ جب ہم فقط عقل دوڑاتے ہیں تو گمراہ ہوجاتے ہیں پس ہمیں چاہیے کہ کلامِ الہیٰ کی ہدایت بغیرکچھ نہ کریں۔

چلئے۔ ابتدا سے شروع کریں۔ انسان کیونکر وجود میں آیا؟کیا اس کی روح ازل سے ہے ؟کیا وہ خدا سے نکلا یا خدا نے اس کو خلق کیا؟ اس امرمیں بائبل شریف کا جواب نہایت صاف ہے۔ پیدائش کی کتاب کے پہلے اوردوسرے ابواب میں بتایا جاتا ہےکہ خدا نے انسان کو بنایا۔ (۱۔ ۲۶ سے ۲۸ تک اور ۲۔ ۷سے ۸ تک) پھرپولوس کے خطوط میں انسان کے خلق

ہونے کا ذکر ہے۔ مثلاً ۱کرنتھیوں ۱۱۔ ۹ ۔ کلسیوں ۲: ۱۰ اور
مقدس یعقوب بھی اس کا ذکر کرتا ہے (یعقوب ۳: ۹) پھر سیدنا
مسیح نے انسان کے خلق ہونے کا ذکر کیا۔ (مرقس ۱۰: ۶) پر
الگ الگ آیات کا یا حوالہ دینا یا ان کا اقتباس کرنا ضروری نہیں
کیونکہ تمام بائبل میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ خدا نے
آسمان وزمین اورجو کچھ اُن میں ہے خلق کیا۔

بائبل مقدس کا قدیم بیان قدیم زمانے کے علم کے
مطابق لکھا گیا تھا۔ لہذا اس قدیم بیان کا زمانہ جدید کے علم
کے مطابق ہونا ضروری نہیں۔اُس قدیم بیان کا مقصد سائنس
سکھانا نہیں بلکہ یہ بتانا تھاکہ خدا ان کا اورتمام دنیا کا خالق
ہے۔ بائبل شریف کا مقصدروحانی باتیں سکھانا ہے نہ کہ
سائنس۔ علاوہ اس کے یادر ہے کہ اگرچہ انسان نے دورِ
حاضرہ میں بہت کچھ سیکھا ہے توبھی اس کا علم نامکمل بلکہ
اغلباً ناقص ہے۔ پس خیال کرنا غلط ہے کہ پیدائش کی تعلیم
موجودہ علم کے موافق ہونی چاہیے۔ کیونکہ جس چیز کو ہم
علم کہتے ہیں وہ دراصل کامل نہیں بلکہ علم اور لاعلمی کی
آمیزش ہے۔ اس بناء پر صاف ظاہر ہے اگر کوئی مضمون
پوری حقیقت ظاہر کرے تو وہ یقیناً ہماری ناکامل سمجھ
سے بالکل باہر ہوگا۔

پیدائش کی کتاب میں ارتقا کی تعلیم نہیں ملتی۔
موجودہ زمانے کے تقریباً تمام علماء ارتقا کومانتے ہیں بلکہ
دورِحاضرہ کے اکثر تعلیم یافتہ لوگ ارتقاء کے قائل ہیں۔ مگر
ارتقاء کا مطلب یہ نہیں کہ خدا خالق نہیں کیونکہ ارتقا سے
صرف تخلیق کا طریقہ مراد ہے۔

ازروئے ارتقا انسان کا جسم حیوانی جسم سے بتدریج
پیدا ہوا۔ پر روح کی بابت مسئلہ ارتقا خاموش ہے۔ اُن
مسیحیوں کا جو ارتقا کے قائل ہیں یہ عقیدہ ہے کہ ارتقا خالق
کی ہدایت اوراُس کی مرضی اورحکم کے مطابق ہوا۔ بہر حال
اس بات کی ضرورت نہیں کہ جو کچھ مصنف نے رسالہ"
خداکی بابت مسیحی دین کی تعلیم" میں لکھا ہے اس کو دہرایا
جائے ۔ اس موقع پر اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے۔

انسان کے مخلوق ہونے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ تو
انسان کی روح ازلی ہے اورنہ ممکن ہے کہ وہ خدا کے سے نکلی
ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خدا سے صادر نہیں ہوئی بلکہ

مخلوق ہے۔ انسان بذتیہہ خدا کے ساتھ ایک نہیں اورجب اس کی روح مخلوق ہے تو وہ اپنی ذات میں غیر فانی نہیں ہوسکتی بہت سے مسیحی مانتےہیں کہ انسان کی روح غیرفانی ہے۔ لیکن یہ تعلیم بائبل کے کسی حصے میں نہیں ملتی۔ ذاتی بقا کا وعدہ کہیں نہیں کیا گیا البتہ قیامت کا ہے۔ مقدس پولوس کہتا ہےکہ صرف مسیح کوبقا حاصل ہے(۱تیمتھیس ۱۶:۶) اوراسی نے بقا کو روشن کیا۔(۲تیمتھیس ۱:۱۰)۔

علاوہ اس کے پیدائش کی کتاب انسانیت کی یگانگی کی تعلیم دیتی ہے۔ اورتمام بائبل میں یہی سکھایا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ بنی اسرائیل سمجھتے تھے کہ وہ دیگر قوموں سے بالکل جدا تھے لیکن تمام انبیاء ان کو صحیح تعلیم پر واپس لانے کی کوشش میں لگے۔نیا عہد نامہ صاف طورپر سکھاتا ہے کہ نسلِ انسانی ایک ہے اورخدا کے حضور کوئی نسلی امتیاز نہیں۔رومیوں کے نام کے خط میں لکھا ہے کہ "کچھ فرق نہیں" اس لئے کہ سب گنہگار ہیں اور مسیح سب کےلئے مرا ۔ (رومیوں ۳)نیزگلتیوں کے خط میں یوں مرقوم ہے " نہ کوئی یہودی رہا نہ یونانی، نہ کوئی غلام نہ آزاد نہ کوئی مرد نہ عورت" یعنی مسیح میں انسان کی یگانگی اس طورپر ظاہر ہے کہ نہ قومیت نہ دنیاوی درجہ نہ جنس کے سبب سے اس میں خلل ہوسکتا ہے۔ جو تفرقے دنیا میں دکھائی دیتے ہیں وہ انسان کے گناہ کا نتیجہ ہیں اوراس کی فطرت کے خلاف ہیں۔ ذات پات مسیحی دین کی تعلیم کے سخت خلاف ہے ۔ (بنی نوع انسان کا جو تعلق آدم سے ہے یا سمجھا جاتا ہےاس کا ذکر بعد میں ہوگا)۔

ایک سوال جو اکثر پیدا ہوتا ہے۔ جس کا جواب پاک کلام میں نہیں ملتا یعنی یہ کہ آیا ہر آدمی کی روح خاص طورپر خلق کی جاتی ہے یا ماں باپ سے جسم کی طرح وراثتہً ملتی ہے۔ یہ توبیشک سچ ہے کہ پیدائش کی کتاب میں ذکر ہے کہ آدم کے یہاں اس کی صورت وشبیہ پر ایک بیٹا ہوا اوراس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ انسان کی روح اس کے جسم کے ساتھ وراثتہً ملتی ہے۔ مگر ایسی کمزوربنیاد پر عمارت قائم نہیں کی جاسکتی ۔ درحقیقت یہ لوگ مانتے ہیں۔ (جیسا مسیحیوں کو ماننا چاہیے) کہ خدا دنیا میں کام کرتا ہے۔

ان کےلئے مذکورہ بالا سوال کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ کسی صورت میں انسان کی روح مخلوق ہے اوراس کی تخلیق کا طریقہ معلوم کرنا ممکن نہیں اوراگر معلوم ہو بھی سکتا تو اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا۔

انسان کی بابت کلامِ الہٰی سکھاتا ہے کہ وہ خدا کی صورت اورشبیہ پر بنایا گیا۔ پیدائش کی کتاب میں یوں مندرج ہے۔ " خدا نے کہا ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں۔۔۔۔ اورخدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا"(۱۔ ۲۶ ۔ نیز دیکھو ۵۔ ۱)یہ تعجب کی بات ہے کہ اس بات کا ذکر پھر عہدنامہ عتیق میں نہیں مگر پولوس رسول اس کی طرف اشارہ کرتا ہے جب لکھتا ہے" تم نے پرانی انسانیت کو اُس کے کاموں سمیت اُتارڈالا اورنئی انسانیت کو پہن لیا ہے جو۔۔۔۔۔۔ اپنے خالق کی صورت پر نئی بنتی جاتی ہے"۔ بہر حال اگرچہ بائبل شریف میں اس بات پر بہت زورنہیں دیا گیا کہ انسان خدا کی صورت پر بنایا گیا یا کم ازکم اس کا بہت ذکر نہیں تو بھی جب سیدنا مسیح نے خدا کو ہمارا باپ کہا تو ایسی حقیقت کا اعلان کیا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا تعالیٰ اورانسان میں کسی قدرموافقت ہے۔ کیونکہ جب خدا ہمارا باپ ہے تو نہ صرف ہم پر مہربان ہے اورہم سے محبت رکھتا ہے اورہماری پرورش کرتا ہے بلکہ اُس میں اور ہم میں چندصفات مشترک ہیں۔

اس مسئلہ کا کیا مطلب ہے کہ انسان خدا کی صورت پر بنا۔ یادرر ہے کہ جب انسان گنہگارہوا تو خدا کی صورت پورے طورپر نہیں کھوئی گئی ۔ورنہ وہ ہمارا باپ نہ رہتا۔ ہماری ابنیت میں خلل ضرورہوا یہاں تک کہ ہم کو دوبارہ اُسے پورے طور پر حاصل کرنا پڑتا ہے۔ (۱یوحنا ۱: ۱۲) لیکن پوری ابنیت کا امکان قائم رہا۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ سمجھا جاتا تھاکہ آدم کو ازحد لیاقت حاصل تھی جس کواس نے گناہ کرکے کھودیا۔ یہاں تک کہ ایک واعظ نے کہا کہ " ارسطا طالیس محض آدم کا بگاڑ تھا"۔ لیکن یہ محض خیال تھا اور متروک ہوا۔

انسان میں ارادہ: راستی اورناراستی کی پہچان اورمحبت سب موجود ہیں اوریہ خدا کی صفاتِ ستودہ میں سے ہیں اورنیز انسان میں خداداد الہٰی صورت ہے۔ آدمیوں میں قوتِ

ارادہ ہے جس سے وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کسی موقعے پر کیا کریں اورکیا نہ کریں اگرچہ آدمی کی قوت محدود ہے اوراوقات جوکام کرنا چاہتا اوراس کے کرنے کا ارادہ بھی کرتا ہے اُسے نہیں کرنے پاتا۔اس قوتِ ارادہ کے ذریعہ سے انسان نے دنیا کی صورت بہت تبدیل کی ہے بعض موقعوں پر خوبی کے ساتھ مثلاً ہم جنگلوں سے کھیتوں باغوں وغیرہ کا مقابلہ کریں اور بعض موقعوں پر بُری طرح سے مثلاً دنیا کی اُن خرابیوں سے جو انسان کے لالچ ، شہوت، خود غرضی ، ظلم وغیرہ کا نتیجہ ہیں۔ اس قوت سے انسان ایک قسم کاماتحت یا نائب خالق ہوگیا۔ اسی سے انسان یہاں تک خود مختار ہے کہ اس کے افعال اسی کے ہیں اُس سے کرائے نہیں جاتے۔

انسان نیکی اوربدی کا فرق سمجھتا ہے اوریہ فیصلہ کرتا ہے کہ نیکی کروں اوربدی سے کنارہ کش رہوں۔ نیز انسان محبت کرنے کی طاقت ہے اوریہ خدا کی صفاتِ ستودہ میں سب سے بڑھ کر ہے۔یہاں تک کہ کلام الہیٰ میں آیا ہے کہ خدا محبت ہے (۱یوحنا ۴: ۱۶)۔ یہ صفتیں انسان میں خدا کی شبیہ ہیں۔پھر انسان میں ان صفتوں کے سبب سے خدا کو پہچاننے کی بھی قوت ہے اوراگریہ صفتیں نہ ہوتیں تو وہ خدا شناسی کو ہرگز حاصل نہ کرسکتا۔

انہیں صفات کے سبب سے انسان میں شخصیت پیدا ہوجاتی ہے نوزاد بچے کو ہم بمشکل شخص کہہ سکتے ہیں لیکن جیسے بچہ سمجھ میں ترقی کرتا جاتا ہے ویسے ہی اس میں شخصیت پیدا ہوتی اوربڑھتی جاتی ہے۔

انسان مخلوق ہے پر خدا کی صورت پر پیدا ہونے کے سبب سے اشرف المخلوقات ہے۔ انسان معصوم پیدا ہوا اور بنی نوع انسان نے معصومی کھودی ہے اورگناہ کی وجہ سے ہم میں خدا کی صورت یہاں تک بگڑ گئی کہ انسان میں وہ دوبارہ پیدا ہونا چاہیے۔

پس خدا نے انسان کو اپنے ارادہ سے خلق کیا اورکرتا رہتا ہے۔ مرد اورعورت پیدا کیا۔ ایک ہی نسل سے پیدا کیا اورجہاں تک مخلوق کیلئے مناسب تھا اپنی صورت اورشبیہ پر پیدا کیا تاکہ انسان خدا کی قربت حاصل کرے اس سے محبت رکھے۔ اس کی عبادت کرے اس کی بتائی ہوئی راہوں پر چلے اورابد تک اس کے ساتھ رہے۔

باب دوم
انسان کی موجودہ حالت

اب آگے بڑھنے سے پہلے اس غرض سے کہ ہم دیکھیں کہ درحقیقت مبحث کا دائرہ کتنا وسیع ہے اورہم کوکن کن باتوں پر غورکرنا ہے۔ چاہیے کہ ہم انسان کی موجودہ حالات کو سوچیں۔ پہلے باب میں ہم نے دیکھا کہ ازروئے بائبل انسان خدا کی صورت پر خلق ہوا ۔ معصوم، خدا شناسی کے قابل، نیک وبد میں امتیاز کرنے کے لائق اورصاحب ارادہ یہاں تک کہ وہ نیکی وبدی میں سے ایک کو چن سکتا تھا۔ انسانی فطرت اس قسم کی ہوئی مگردراصل ہم انسان کا کیا حال دیکھتے ہیں۔

ایک پشت کے اندر دوعالمگیر جنگیں ہوئیں۔ پہلی میں خونریزی اس قدرزیادہ ہوئی جس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ سوم دریا کی لڑائی کے پہلے دودن میں یورپ کی تمدنی صورت بدل گئی کیونکہ ان دونوں میں جرمنی اورانگلستان کے بہترین جوان کھیت آئے۔ اگرجنگ نہ ہوتی تو وہ جوان آج ہر مہم میں اپنے اپنے ملک کے پیشوا ہوتے۔ نیوشپل کی لڑائی کے پہلے دوگھنٹوں میں جیسا بیان کیا جاتا ہے صرف انگریزوں کی فوج میں آدھ لاکھ سپاہی قتل اورمجروح ہوئے۔ اس جنگ میں وہ تو قومیں شریک ہوئیں جو تمدن اورشائستگی میں دنیا کی پیشوا سمجھی جاتی تھیں یعنی فرانس، جرمنی، انگلستان اورامریکہ ۔ پھر ایک غور طلب بات یہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنی علم میں ، تجارت میں، شائستگی میں یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں سے ایک تھی۔ اورہرروزترقی کرتی جاتی تھی۔ صرف ایک بات کی ضرورت تھی تاکہ جرمنی یورپ بلکہ شاید دنیا میں اوّل ہوجائے یعنی صلح، مگر دیوانہ کی طرح جرمنی جنگ پر تلی رہی اورآخر کار جنگ کو شروع کیا پھر چاربرس میں ہارگئی اوراپنی ممتازی سے گرگئی۔

دوسرے ملک بھی قصوروارتھے مگر اس میں شک نہیں کہ جرمنی کے بڑے بڑے سپہ سالاراوروزراء اورنیز جرمنی کے قیصر اگر چاہتے تو جنگ کو روک سکتے لیکن اورکوئی ملک نہیں روک سکتا تھا۔

۱۹۱۸ء میں وہ جنگ ختم ہوئی اورجو ملک جیت گئے اُن کے وزیر اورایلچی صلحنامہ لکھنے کیلئے فراہم ہوئے مگر

سو برس کے اندر لوگ بہت کچھ بگڑ گئے ہیں کیونکہ ۱۹۱۵ء میں جب نپولین قیصر آخر کار ہار گیا تو اگرچہ فرانس تقریباً ۲۵ سال سے یورپ میں جنگ کرتا تھا اور اس نے کوشش کی کہ اُس تمام براعظم کو اپنے قبضے میں کرے تو بھی اس کے دشمنوں نے فرانس کو زیادہ پست کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ مگر ۱۹۱۹ء میں فاتح قوموں نے مفتوح قوموں کو گویا برباد کرنے کا انتظام کیا۔

پھر فاتحوں نے آپس میں ایکا کیا کہ قوموں کو انجمن (لیگ) قائم ہو تاکہ جنگ کے اسباب موقوف کردئیے جائیں۔ اُس جنگ کے وقت عین اسی اثناء میں جنگ کی بابت کہا جاتا تھا کہ یہ ایک جنگ ہے جس کا مقصد جنگ کو موقوف کرنا ہے۔ مگر امریکہ نے لیگ کی تجویز کو منظور نہ کیا اور جب انگلستان او رمصر میں نااتفاقی ہوئی تو انگلستان نے اُس معاملہ کو لیگ کے سامنے پیش کرنے سے انکار کیا۔ ہوتے ہوتے لیگ کمزور ہوتی ہوگئی اور یہ پہچانا گیا کہ وہ کسی بڑے ملک کو جنگ اور ظلم کرنے سے نہیں روکے گی۔ پہلے جاپان نے منچوریا پر حملہ کیا پھر چین پر اور اٹلی نے حبش پر دھاوا مارا اور لیگ نے کچھ نہیں کیا۔ سچ مچ لیگ کچھ نہ کرسکی کیونکہ جن ملکوں سے وہ مرکب تھی ان میں سے کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ جنگ روکنے کے لئے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالے۔

جرمنی میں ہٹلر برپا ہوا اور اٹلی میں مسولینی جنگ کے لئے تیار ہوا اس وقت (۱۹۲۴ء) گذشتہ عالمگیر جنگ سب کو یاد ہے۔ پولینڈ کی بربادی، فرانس کا ہتھیار ڈال دینا۔ سلطنتِ برطانیہ کا اکیلا رہ جانا۔ جاپان کا اچانک اعلان جنگ کے بغیر دھاوا مارنا ۔ غنیم کی بڑی بڑی فتوحات ۔ پھر ان کا رفتہ رفتہ شکست کھانا۔ ہٹ جانا، مغلوب ہونا، مسولینی کی گرفتاری ، نکل بھاگنا۔ اور موت، جرمنی کا بالکل برباد ہونا۔ یہاں تک کہ تمام انتظام درہم برہم ہوا۔ اور قریب قریب تمام دنیا میں ضروری سامان۔ کھانے ،کپڑے ، مٹی کے تیل ، کوئیلوں کی قلت ہوئی۔

پھر یونائٹیڈ نیشنز اورگنائزیشن (یو۔این ۔او) کا قائم ہونا۔ اُس میں بھی پھوٹ پڑنا۔ مشرقی قوتوں یعنی روس اور روس کے ساتھیوں کا امریکہ اور برطانیہ پر شک کرنا۔ یہاں تک کہ بہت جلد لوگ تیسری جنگ کے امکان کا ذکر کرنے لگے۔

سب سے خراب بات یہ نہیں۔ کیونکہ ۱۹۴۵ء میں ایٹم بم ایجاد ہوا۔ جس میں مادہ کے ذرات کی طاقت کام میں آتی ہے۔ اگرپھر ایسے ایسے دوملکوں کے درمیان جن کے پاس یہ بم ہوں جنگ ہوجائے توایک دوروز کے اندر ایک اور اغلباً دونوں کے بڑے بڑے شہر مسمار ہوجائینگے۔

اتنے برسوں بلکہ صدیوں کی تعلیم اورترقی کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ انسان نے ایک ایسی چیز ایجاد کی جس سے اندیشہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنی تمام شائستگی سمیت اوراپنا سارا مال ودولت برباد کرے۔ اتنی قابلیت، اتنا علم، اتنی ترقی، اتنی لنترانیاں اوریہ نتیجہ !!

بیرونی تعلقات سے نظر ہٹا کر ملکوں کی اندرونی حالت پر نگاہ کریں۔ برسوں سے ہند کے باشندے آزادی کے درپے رہے ہیں اوربڑی کوششوں اوربہت تکلیفوں کے بعد ۱۵اگست ۱۹۴۷ء کو کامیاب ہوئے ۔ مقصد حاصل ہوا اورفوراً خون کے دریا بہنےلگے۔ مغربی اورمشرقی پنجاب، بہار، دہلی سب میں قتل عام ہوا۔ نیز لاکھوں خاندان وطن سے نکل کر بھاگنے پر مجبور ہوئے یا کم ازکم اپنے آپ کو مجبور سمجھے۔جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ قریب قریب بیان سے باہر ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہند کے سب سے بڑے آدمی مہاتما گاندھی قتل کردئیے گئے ۔

لیکن ہند اکیلا مصیبتوں میں مبتلا نہیں برمامیں دشمنوں نے وزیروں کو قتل کیا۔ امریکہ میںیکے بعد دیگرے اسٹرائیک اورہڑتال ہوئے۔ فرانس میں گڑبڑی، انگلستان میں دیوالہ نکلنے کا خوف، جرمنی، میں بھوک، یونان میں خانگی جنگ، کسی ملک میں پھوٹ، کسی میں ظلم، کسی میں رشوت کا زور، الغرض کسی ملک میں خوشی اورامن وامان نہیں۔

پھر شخصی زندگی پر نظر کریں۔ بہت کم لوگ خوش ہیں بہت کم بااطمینان ہیں۔ آدمی ارادہ اورکرتا ہے اورکام اوربڑے بڑے ارادے ۔ بڑی بڑی تجویزیں۔ مگر نتیجہ یا توبہت معمولی یا کچھ بھی نہیں۔ ہرسولوگ پریم کا دم بھرتے ہیں مگر اپنی زندگی، اپنے چال چلن اوراپنے برتاؤ میں دکھاتے نہیں۔

یہ تو کوئی نئی بات نہیں ۔ جس کا میں ارادہ کرتاہوں وہ نہیں کرتا بلکہ جس سے مجھے نفرت ہے وہی کرتاہوں۔۔۔۔

چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کاارادہ نہیں کرتا اسے کرلیتا ہوں"۔ انسان کا حال یہ ہے کہ اس کی نیکی بھی خود غرضی اورگناہ سے آلودہ ہے اوراس کے اچھے ارادوں کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اگرچہ اس کی قابلیت بہت زیادہ ہے بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایک پشت کے اندر اس کی شائستگی اس کا تمدن، اس کی دولت اس کے شہر سب برباد ہونگے۔ کیونکہ ایٹم بم کے ایجاد کا یہی نتیجہ ممکن بلکہ اغلب ہے۔

باب سوم

اخلاقی ذمہ داری

عہدنامہ عتیق (یعنی توریت ۔ زبور۔ انبیاء کے صحیفے اورعبرانیوں کے دیگر مقدس مکتوبات) اس بناء پر لکھا گیا کہ انسان اپنے کاموں کا ذمہ داراورجواب دہ ہے۔اس کے ہر حصے میں نیک کاموں کا اچھا اجر اوربُرے کاموں کی سزا دونوں بڑی صفائی سے بتائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلی کتاب میں ہم یوں لکھتے ہیں کہ خداوند نے قائین سے کہا" اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا اوراگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا ہے اورتیرا مشتاق ہے پر تو اس پر غالب آ"۔ توریت کی باقی چار کتابوں میں شریعت بتائی گئی ہے اوریہ آیا ہے کہ" میں نے آج کے دن زندگی اوربھلائی کو اورموت اوربرائی کو تیرے آگے رکھا ہے کیونکہ میں آج کے دن تجھ کو حکم کرتاہوں کہ تو خداوند اپنے خدا سے محبت رکھے اوراس کی راہوں پر چلے اوراُس کے فرمان اورآئین اوراحکام کو مانے تاکہ تو جیتا رہے۔ اوربڑھے اورخداوند تیرا خدا اُس ملک میں تجھ کو برکت

بخشے جس پر قبضہ کرنے کو تو وہاں جارہا ہے پر اگر تیرا دل برگشتہ ہوجائے اورتو نہ سنے بلکہ گمراہ ہوکر اور معبودوں کی پرستش اورعبادت کرنے لگے تو۔۔۔۔ تو ضرور فنا ہوجائے گا" (استشنا ۳۱: ۱۵ وغیرہ) شریعت اوراحکام صرف ایسوں کو دئیے جاتے ہیں جو ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں اورسزا وجزا کا ذکراُن لوگوں سے کیا جاتا ہے جو جوابدہ ہوں۔

اسی طرح سے زبورمیں باربارنیکوں سے اچھے وعدے اوربُروں سے وعید کئے جاتے ہیں۔پہلے ہی مزمورسے لیکر تقریباً آخری مزمورتک یہ بات تعلیم کی جاتی ہے کہ انسان نیکی کرنے اور بدی سے پرہیز کرنے پر مختار ہے۔انبیاء کے صحیفے حکموں اورنصحیتوں سے بھرے ہیں اورتواریخی کتابوں میں خدا کی راہوں پر چلنے کے اچھے نتیجے اوراُن سے گمراہ ہونے کے بُرے نتیجے باربار دکھائے جاتے ہیں۔ لکھنے والوں نے محض اس بات میں دلچسپی نہیں پائی کہ گذشتہ زمانہ میں کیا کیا واقعہ ہوا بلکہ اس میں کہ پُرانے وقت کے واقعات میں نیکی اوربدی کے کیا کیا نتیجے ہوئے اورآدمیوں نے اپنے کاموں کا کیا پھل پایا یہاں تک کہ بڑے زبردست بادشاہوں کے کام قریب قریب قلم انداز کئے گئے مثلاً یرُبعام ثانی کے کام۔ مگران سے چھوٹے بادشاہوں کا زیادہ مفصل حال لکھا گیا ہے کیونکہ ان کے زمانہ کے واقعات سے انسان کو اخلاقی سبق مل سکتے ہیں۔

یہ توسچ ہے کہ عہدنامہ عتیق میں جابجا ایسے فقرے ملتے ہیں جن سے پہلی نظرمیں یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ خدا نے آدمیوں سے بُرائی کرائی یا کراتا ہے۔مثلاً خروج ۹: ۱۲۔ " خدا نے فرعون کا دل سخت کیا۔پھر کئی بار" فرعون کا دل سخت ہوا" (مثلاً۹: ۳۵) پرنویں باب کی ۳۲ ویں آیت میں لکھا ہے کہ " فرعون نے ۔۔۔۔ اپنا دل سخت کرلیا"۔ جب سارا مضمون پڑھا جاتا ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں محاورے ایک ہی بات کیلئے استعمال ہوئے ۔ درحقیقت جب گنہگار سنتا نہیں تو وہ اپنا دل سخت کرلیتا ہے پر خدا نے انسان کو ایسا بنایا کہ نہ سننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا دل سخت ہوجاتا ہے اوراس معنی میں خدا گنہگار کے دل کو سخت کردیتا ہے۔

اگر ضرورت ہوتی تو خادم تین چاراورآیات نکال سکتا جن کے رو سے پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ بدی خدا سے

منسوب کی جاتی ہے پر ایسی آیات کم ہیں اورجب قرینے کے ساتھ اورپورے عہد عتیق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں تو شک کا موقع نہیں کہ پُرانے عہدنامے کی تعلیم یہ ہے کہ انسان نیکی وبدی کو پہچان کر ان میں سے ایک چننے پر قادر ہے اوراپنے کاموں کا ذمہ دار ہے۔

عہدِ نامہ جدید اناجیل اربعہ ۔ رسولوں کے اعمال رسولوں کے مکتوبات اورمکاشفہ کی یہی تعلیم ہے ۔ کہیں یہ تعلیم نہیں ملتی کہ انسان قسمت کے بندھنوں سے بندھا ہے۔ قسمت کی تعلیم بائبل میں نہیں ملتی۔ سیدنا مسیح نے ہر وقت یہ تسلیم کیاکہ انسان جوابدہ ہے اوراسی لئے آدمیوں سے وعدہ کرتا آدمیوں کو حکم اوردعوت دیتا تھا اوربھلے کاموں کا اجر اوربُرے کاموں کی سزا بتایا کرتا تھا۔نئے عہد نامہ کی دیگر کتابوں کا یہی حال ہے۔بہرکیف ممکن ہے کہ چند پڑھنے والے مقدس پولوس کے چند فقروں سے گھبراجائیں۔ مثلاً رومیوں کا نواں باب اس پر یہ لکھنا کافی ہے کہ اس باب کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ جب خدا نے ہم کوایک بار چنا ہے توپھر رد نہیں کرسکتا۔ مگر یہ ٹھیک نہیں کیونکہ کسی قوم کا چُنا جانا خدا کے اختیارمیں ہے۔اورجب وہ قوم وعدہ کی شرائط پوری نہیں کرتی تو چھوڑی دی جائے گی۔ پھر پولوس کے تمام خطوط سے ظاہر ہے کہ وہ انسان کی ذمہ داری اور جوابدہی مانتا تھا۔ کسی آیت یا کسی باب کو پاک کلام کے باقی حصوں سے الگ کرکے اُس سے نتیجہ نکالنا بہت سی غلطیوں اوربدعتوں کا بارباباعث ہوا ہے۔

نیا عہدنامے کے کئی مقاموں میں عدالت کا ذکر ہے۔ سیدنا مسیح کی تمثیلوں میں سے ۴۸ فیصد عدا لت کے بارہ میں ہیں۔ پولوس رسول مسیح کے تختِ عدالت کا ذکرکرتے ہیں۔ " ضرورہے کہ مسیح کے تختِ عدالت کے سامنے جاکر ہم سب کا حال ظاہر کیا جائے تاکہ ہر شخص اپنے ان کاموں کا بدلہ پائے جو اس نے بدن کے وسیلے سے کئے ہیں خواہ بھلے ہوں خواہ برُے"(۲کرنتھیوں ۵: ۱۰) الغرض تمام بائبل میں انسان کی ذمہ داری وجوابدہی تسلیم کی جاتی ہے۔ پس یہ بے شک مسیحی دین کی تعلیم ہے۔

ذمہ داری کی کچھ ضروری شرطیں ظاہرہیں اورجب یہ پوری نہیں ہوتیں توکسی کو جوابدہ ماننا یا ٹھہرانا بے انصافی

میں داخل ہوتا ہے اوریہ شرائط وہ ہیں یعنی علم اورچُننے کی طاقت۔ جو شخص نہیں جان سکتا کہ کوئی کام بُرا ہے وہ اس کے کرنے کا پورے طورپر ذمہ دارنہیں ہوسکتا۔ میری بّلی کو معلوم نہیں کہ میری پالوچڑیا کو نہیں مارنا چاہیے اوراگر میں چڑیا کی حفاظت نہ کروں اوربلّی اسے کھاجائے تو بلی پر خفا ہونا حماقت اور بے انصافی ہے۔ برعکس اس کے کتّے اکثر بچپن میں سیکھ سکتے ہیں کہ چند کام منع ہیں اورجب ایسے ایسے کاموں کو کربیٹھتے ہیں تو ان کے مالک ان کو سزادیتے ہیں اورآدمی چونکہ سمجھ رکھتے ہیں اس لئے ہر ملک میں جواب دہ سمجھے جاتے ہیں۔

علیٰ ہذا لقیاس ہمارے خداوند فرماتےہیں" وہ نوکر جس نے اپنے مالک کی مرضی جان لی اورتیاری نہ کی نہ اس کی مرضی کے موافق عمل کیا بہت مارکھائے گا مگر جس نے نہ جان کر مارکھانے کے کام کئے وہ تھوڑی مارکھائے گا" (لوقا ۱۲: ۴۷تا ۴۸)۔ اورپولوس نے اتھینی میں کہا کہ خدا نے جہالت کے وقتوں سے چشم پوشی کی (اعمال ۱۷: ۳۰) نیز" جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا" اوریعقوب کے خط میں یوں آیا ہے" جو کوئی بھلائی کرنا جانتا ہے اورنہیں کرتا اس کے لئے یہ گناہ ہے"(یعقوب ۴: ۱۷) خود مختاری بھی شرط ہے۔ اس کے بارہ میں کیا کہیں سوا اس کے کہ تمام بائبل میں یہ لازمی تسلیم کی گئی ہے ۔ یہاں تک کہ اس کا ذکر بھی نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے:

جب کسی ملک میں یا کسی قوم کے درمیان کوئی بات ایسی تسلیم شدہ ہوتی ہے کہ کسی کے دل میں اُس پر کبھی شک پیدا نہیں ہوتا تو عموماً اُسی کا ذکر نہیں کیا جاتا یا کم ازکم اگراس کا ذکر ہوتا بھی ہے تو صرف اس لئے کہ اس کی بناء پر کوئی دلیل قائم کی جائے۔ مثلاً بائبل میں خدا کی ہستی کا ثبوت نہیں دیا جاتا کیونکہ اس کے لکھتے وقت تقریباً تمام لکھنے اورپڑھنے والے خدا کی ہستی کو تسلیم کرتے تھے مگر چونکہ خدا کی صفتوں کی بابت کسی قدربحث مباحثہ ہوتا تھا اس لئے اکثر خدا کی صفتوں مثلاً اُس کی وحدانیت کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

بے شک انسان میں نیکی وبدی کی پہچان ہے جو لوگ موسوی شریعت سے ناواقف ہیں وہ بھی دل میں ایسے قوانین

گویا ایسی طبعی شریعت جانتے اورمانتے ہیں جس میں اگرچہ نقص ہوں تو بھی بہت سی اچھی اورسچی باتیں موجود ہیں۔" جب وہ قومیں جو شریعت نہیں رکھتیں اپنی طبیعت سے شریعت کے کام کرتی ہیں تو باوجود شریعت نہ رکھنے کے وہ اپنے لئے خود ایک شریعت ہیں۔ چنانچہ وہ شریعت کی باتیں اپنے دلوں پر لکھی ہوئی دکھاتی ہیں اوران کا دل بھی ان باتوں کی گواہی دیتا ہے" (رومیوں ۲: ۱۴تا ۱۵)اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جن کو خدا کے دئیے ہوئے احکام صحیح طورپر معلوم نہیں وہ بھی اپنے آبائی دین کی تعلیم کے موافق اور خداداد اخلاقی پہچان کے بموجب نیکی اوربدی میں امتیاز کرسکتے ہیں۔ یہ توضرورماننا چاہیے کہ جن کاموں کی بابت لوگوں کو معلوم نہیں کہ گناہ ہیں مثلاً بُت پرستوں کے درمیان بُت پرستی یا مسلمین کے درمیان کثرتِ ازدواج ۔ ان کاموں کے سبب سے ان لوگوں کو گناہ آلودہ نہیں کہنا چاہیے۔ بہرحال وہ کام گناہ ہیں اوراُن کے نتیجے نہایت بُرے ہوتے ہیں پر جو لاعلمی میں ان کے مرتکب ہوتے ہیں ان پر الزام لگانا انصاف نہیں۔ کیونکہ " جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا" (رومیوں ۵: ۱۳) توبھی افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر آدمی طبعی شریعت پر عمل نہیں کرتے ۔ اس کتاب کے ہر دیکھنے والے کو اُسی کے تجربہ سے معلوم ہے کہ ہم ان تمام اچھی باتوں کو جو ہم فرض سمجھتے ہیں پورا نہیں کرتے اورجن کاموں کو ہم بُرا مانتے ہیں ۔ ان کو وقتاً فوقتاً کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بہت سے لوگ قسمت کو ماننے کے سبب سے انسان کو خود مختار نہیں مانتے اورفی زمانہ دورِ حاضرہ کے علوم سیکھنے سکھانے والے بھی انسان کو مجبور سمجھتے ہیں۔ وہ خدا کی مرضی کو ایسا سمجھتے ہیں کہ انسان ہر بات میں اس کے ماتحت ہے اورجوکچھ کرتا ہے وہ اُس کے لئے پیشتر سے ٹھہرایا ہوا ہے۔یہ کہتے ہیں (غلط کہتے ہیں)کہ سائنس سے معلوم ہے کہ جوکچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ قدرتی نظام کے اندر لاتبدیل قاعدوں کے موافق ہوتا ہے۔ بہرحال دونوں اپنی گفتگو اورچال چلن سے دکھاتے ہیں کہ یہ عقیدہ حقیقی نہیں۔ جو کوئی ان الفاظ ۔ چاہیے ، لازم ، فرض میں سے کسی کو استعمال کرتا ہے وہ دکھاتا ہے کہ میں انسان میں خود مختاری مانتا ہوں کیونکہ یہ الفاظ کسی مجبور

شخص یا شے کے بارہ میں استعمال کرنا بے مطلب ہے۔ جو مجبور ہے وہ صرف وہی کام کرتا ہے جس پر مجبور ہے اسے سمجھانا اوراُس کی بابت یہ کہنا کہ اورکوئی کام کرنا چاہیے حد سے زیادہ بے معنی فقرہ استعمال کرنا ہے۔

جب کسی آدمی کے سامنے دوکام درپیش ہوتے ہیں تو بعض اوقات شاید اکثر اوقات وہ بے سوچے سمجھے وہ کام چُنتا ہے جو اُس کی عادتوں کے موافق ہے۔عموماً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس وقت جوکام زیادہ مفید یا مرغوب یا پسندیدہ ظاہر ہوتا ہے وہی کیا جاتا ہے۔ عادت کا یہی مطلب ہے۔ جب ہم انسان کی خودمختاری پر غورکرتے ہیں تو الگ الگ کاموں ہی پرغور کرنا کافی نہیں کیونکہ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ہرایک کام کی بابت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ممکن تھاکہ میں نے جو کیا وہ نہ کرتا پر دوسرا کام کرتا توبھی ہر موقعے کےلئے ہم عمربھر تیاری کرتے رہتے ہیں۔ جن کاموں پر ہم متوجہ ہوتے اورجن کے فائدوں اورجن کی ظاہری یا حقیقی خوبیوں پر دھیان دیا کرتے ہیں ہم اپنے آپ کو ان کے راغب بناتے اوران کے کرنے کی تیاری کرتے ہیں یہاں تک کہ خاص موقع پر چُننا اور امتیاز کرنا ناممکن ہوتا ہے " مندرکا دروازہ کھل گیا اورجو بہترتھا وہی نکلا"۔آدمی ہر موقعے پر جوکچھ فیصلہ کرتا ہے وہ اُس کی تمام گذشتہ زندگی۔ خیالات ۔ اقوال وافعال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

بعض لوگ جو انسان کی خود مختاری کے قائل ہیں مبالغہ کرتے ہیں۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی ہر وقت بالکل آزاد رہتا ہے۔ اوّل جیسا اوُپر ذکر ہوچکا ہروقت ہم اپنی گذشتہ زندگی کے سبب سے فیصلہ کرتے ہیں او ر اگرچہ ہر موقعے پرکسی قدرآزاد ہیں توبھی پورے طورپر نہیں۔ نشہ بازآدمی ارادہ کرتا ہے کہ پھر نہیں پئیوں گا پر جب شراب پینے کا موقع ملتا ہے تو اس کے ارادے رائیگا ں جاتے ہیں۔ نازک مزاج آدمی پھرغصہ نہ کرنے کی ٹھان لیتا ہے مگر وقت پڑے پر حسبِ دستورخفا ہوتا ہے۔نیز ہم اپنے ماحول، اپنی موروثی طبعیت، اپنی تربیت، سب کی وجہ سے محدود رہتے ہیں۔ گویا سبب کے بندھنوں سے بندھے رہتے ہیں اوران تمام باتوں کے سبب سے ہماری خود مختاری میں کمی ہوتی ہے۔ یہ خیال کرناکہ آدمی ان باتوں کے باوجود ہر معاملہ میں یوں

ہی ایسا ارادہ کرسکتا ہے کہ گویا اُس میں کوئی رحجان ۔ کوئی میلان ، تربیت کے سبب سے کوئی غلط فہمی ، موروثی طبیعت کے سبب سے کوئی کمزوری نہیں۔ حماقت کے قریب ہے۔

بہر کیف انسان کی خودمختاری ماننا چاہیے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر آدمی ہر موقع پر آزاد ہے بلکہ یہ کہ جو کچھ ہر شخص کرتا ہے وہ اُسی کا فعل ہے۔ اس کے باہر کوئی شخص اس کو مجبور نہیں کرتا ۔ مثلاً زید اوربکر ایک ہی خاندان میں پیدا ہوئے ایک ہی اسکول میں تعلیم پانے کے بعد ایک ہی شہر میں ایک ہی پیشہ اختیارکرتے ہیں۔ بچپن سے زید اچھی باتوں پر دھیان دیتا ہے۔ خدا کی عبادت میں وقت لگاتا ہے وغیرہ مگر بکر بُری باتوں پر زیادہ توجہ کرتا خدا اور الٰہی باتوں سے بھاگتا ہے اپنی نفسانی خواہشوں کو روکتا نہیں۔ چالیس برس کی عمر میں زید اوربکر بالکل جداگانہ اشخاص ہوں گے اورکسی ایک موقع پر جداگانہ کام کرینگے۔ یہ اُن کی تمام عمر کے فیصلوں اورتوجہ کا نتیجہ ہے۔ اسی سبب سے بائبل میں مرقوم ہے" لڑکے کی اس راہ میں تربیت کر جس میں اُسے جانا ہے۔ وہ بوڑھا ہوکر اُس سے نہیں مڑیگا" (امثال ۲۲: ٦) پر ممکن ہے کہ لڑکا تربیت کوقبول نہ کرے ۔ کتنی بارخادم کو افسوس ہوا ہے جب اُس نے جوان ماں باپ کو بچہ کو اُس کی خواہش پر چھوڑتے دیکھا کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ آئندہ ایسے بچہ کی تربیت مشکل ہوگی۔ جب اکیلا لڑکا اپنے آپ کو گھر کا مالک سمجھنے لگتا ہے جس کی ہر خواہش ضرور فوراً پوری کی جاتی ہے تو اس کی آئندہ زندگی مشکل ہوجاتی ہے۔

بہر حال زید وبکر دونوں کے کام انہیں کے ہیں کوئی ان کو مجبور نہیں کرتا۔ ان کی مجبوری انہیں کی بنائی ہوئی ہے اوردونوں اپنے افعال کے جواب دہ اور ذمہ دار ہیں۔ تواریخ پڑھتے وقت ہم ایسے ایسے لوگوں کا حال دیکھتے ہیں جو شرارت اورظلم میں مشہور اور ضرب المثل ہیں۔مثلاً نیروقیصر، ہٹلر، ایک وقت تھاکہ یہ جو شیطان مجسم سمجھے جاتے ہیں معصوم بچے تھے پر انہوں نے اپنےآپ کو ہوتے ہوتے شریربنادیا۔ تمام بائبل مقدس میں شاید سب سے ہولناک آیت یہ ہے" جوبرائی کرتا ہے وہ برائی کرتا جائے اورجونجس ہے وہ نجس ہو ہوتا جائے "(مکاشفہ ۲۲: ۱۱) کیونکہ اُس سے

معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ خدا بُرے آدمیوں کو اُن کی برائی پر چھوڑدے گا جیسا زبورمیں مندرج ہے" پس میں نے اُن کو اُن کے دل کی ہٹ پر چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنے ہی مشوروں پر چلیں" کس وجہ سے " اس لئے کہ" میرے لوگوں نے میری بات نہ سنی اوراسرائیل مجھ سے رضامند نہ ہوا" (زبور ۸۱: ۱۲اور۱۱) پھر " افرائیم بتوں سے مل گیا ہے۔ اُسے چھوڑ دو" (ہوسیع ۴: ۱۷)۔

ماحول کی بابت کچھ اور لکھنا چاہیے کسی نے کہا کہ ایک دیندارآدمی چھ سات بے دینوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سوتا تواس کا سب کے سامنے گھٹنے کے بل ہوکر دعا کرنا مشکل ہوتا پر اگرچھ سات بشپ ایک ہی کمرے میں آرام کرتے تو ایک کا گھٹنے کے بل ہوکر دعا نہ کرنا مشکل ہوتا۔ مگر عموماً دنیا کے لوگ خدائی باتوں کے خلاف ہوتے ہیں اوراس لئے پادری سڈنی کیوصاحب کے قول کے بموجب " ہم بدی کی یگانگی سے بے اثر نہیں کیونکہ ہم بُرے کاموں اوربُرے خیالوں کی نظام کے بیچ میں رہتے ہیں" دنیا کی کشش بدی کی طرف ہے اورہرآدمی کچھ نہ کچھ اُس سے متاثر ہوتا ہے۔ پیدائش سے ہم اُس برائی کے درمیان رہتے۔ لکھتے ۔ پڑھتے۔ کودتے کھیلتے اورزندگی بسر کرتے ہیں اوراس سے ہماری خود مختاری اتنی نہیں جتنی ہونا چاہیے۔

وہ تین دین۔ مسیحیت ۔ اسلام اوردین یہود جونبوت کے دین کہلاسکتے ہیں۔ اس بات پرزور دیتے ہیں کہ خدا کی مرضی پوری ہوگی۔ اسلام تو بتاتا ہے کہ خدا کی مرضی پوری ہوتی ہے یعنی سب کچھ اس کی پاک مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کی خود مختاری اورآزادی کا خیال بھی بالکل خام ہے۔ اگر خدا سب کچھ ٹھہراتا ہے تو انسان مجبور ہے۔ جیسا ایک چور نے خادم سے کہا" معلوم نہیں میری قسمت میں کیا لکھا تھاکہ میں چور ہوگیا" شعر مشہور ہے۔

کیا ہنسی آتی ہے مجھے حضرتِ انسان پر
فعلِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر

مگر ایسی بات خدا پر الزام لگانا ہے۔

بعض اوقات مسیحی علماء اس الجھن میں پھنس گئے ہیں اوریہ سکھانے لگے کہ خدا سب کچھ ٹھہراتا ہے۔ لیکن یہ

پاک کلام کی تعلیم سے دور بھٹکنا ہے کیونکہ ذرا بھی شک نہیں کہ بائبل انسان کی خود مختاری سکھاتی ہے۔ ساتھ ہی اسکے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ خدا کی مرضی آخر کارپوری ہوگی ورنہ خدا اپنے مخلوق اپنے مخلوق سے ہارجاتا یعنی خدا ہی نہ ہوتا۔ اس مشکل سے نکلنے کا راستہ یہ ہے۔ اوّل تو خدا اپنی خوشی سے اپنی مرضی کا دائرہ گھٹا سکتا ہے یا یوں کہیں کہ اگرچہ خدا سب کچھ کرسکتا ہے اورکوئی مخلوق اس کی مرضی کا سامنا کرنے کے قابل نہیں توبھی خدا اس بات پر مجبور نہیں کہ اپنی مرضی کے دائرے سے انسان کو مستشنیٰ نہ کرے۔ اگرخدا کی ایسی مرضی ہے تو انسان کو خود مختاربناسکتا ہے۔ دوم۔ بائبل کی یہ تعلیم معلوم ہوتی ہے کہ خدا نے ایسا ہی کیا اوراُس کی مرضی یہ ہے کہ انسان خود مختارہو اورخود مختارہوکر اس کی عبادت وخدمت کرے یعنی خدا انسان پراثرڈالتا ہے پراُس کو مجبورنہیں کرتا۔

نوٹ: ۱۔ ضمیر (کائنشس) خدا نے انسان کو ایسا بنایا کہ وہ ہمیشہ معلوم کرتا ہے کہ مجھے نیکی کرنا اوربدی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ضمیر کے خلاف چلنا بُرا ہے" جو کچھ اعتقاد سے نہیں وہ گناہ ہے"(رومیوں ۱۴: ۲۳) قرینے سے پتہ لگتا ہے کہ جب آدمی اپنے ضمیر کے خلاف غلط فہمی سے بھی چلتا ہے تویہ گناہ ہوتا ہے لیکن ضمیر ہم کو نہیں بتاتا کہ کون کون سے کام اچھے اورکون کون سے بُرے ہیں۔ یہ تربیت اورتعلیم سے ہوتا ہے۔ مصر کے مکدنی بادشاہوں کا ضمیران کو بتاتا تھا کہ شاہزادہ کو اپنی ہمشیرہ کے ساتھ شادی کرنا چاہیے اس لئے کہ شاہی خاندان کے باہر کوئی عورت اس کے لائق نہیں ہوسکتی تھی! ضمیر کے موافق چلیں پر خدا کے کلام اورکلیسیا کی تعلیم سے اپنے ضمیر کو سکھائیں کہ کون کون سے کام اچھے ہیں۔

۲۔ مذکورہ بالا باب میں یہ مانا گیا ہے کہ نیکی اوربدی میں حقیقی فرق ہے۔ یہ ہما اوستی اورمایا دونوں عقیدوں کے خلاف ہے پر یہ دونوں بائبل کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ وہ تعلیم یہ ہے کہ مخلوقات (دنیا ومافہیا)کو حقیقت حاصل ہے پر اُن کی حقیقت خالق کی حقیقت پرمنحصر ہے۔ اگر خدا اُن کو نہ سنبھالے تو وہ جاتے رہیں گے۔ پر نہ تو وہ خدا میں داخل ہیں اورنہ دھوکا ہیں۔

باب چہارم
گناہ

انسان کی موجودہ بگڑی ہوئی حالت جس کا ذکرباب دوم میں ہے گناہ کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ مناسب ہے کہ ہم گناہ کی تشریح کریں۔ تمام مذاہب میں گناہ کی ملامت کی جاتی ہے پر اس کی نسبت ان کی تعلیم جداگانہ ہے۔ تمام بڑے بڑے مذاہب چند کاموں کو گویا یک زبان ہوکر گناہ ٹھہراتے ہیں مثلاً چوری ، زنا، ناحق غصہ، قتل وغیرہ ۔ مگر گناہ کی حقیقت کے بارے میں سب کی تعلیم یکساں نہیں اوربعض کام کسی دین میں گناہ بتائے جاتے ہیں پر اوروں میں اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً بُت پرستی ، بہر حال ہمارا کام مسیحی دین سے ہے اوردیگر مذہبوں سے نہیں۔

دُعائے عام کی کتاب کے اُس حصہ میں جسے اقرارعام کہتے ہیں گناہ کی یہ تشریح ملتی ہے" ہم نے خطا کی ہے اور کھوئی ہوئی بھیڑوں کی مانند تیری راہوں سے بھٹک گئے ہیں۔ ہم نے اپنے دل کے منصوبوں اورخواہشوں کی زیادہ پیروی کی ہے۔ ہم تیرے پاک حکموں کے خلاف چلے ہیں جو ہم کو کرنا لازم تھا وہ ہم نے نہیں کیا اورجو ہم کو کرنا روانہ تھا وہ ہم نے کیا ہے اورہم میں کچھ صحت نہیں"۔

۱۔ خطا زیادہ بھاری لفظ نہیں۔خروج(۳۴: ۷) میں ذکر ہے خدا گناہ اور تقصیر اورخطا کا بخشنے والا ہے۔خطا یہ ہے کہ جس کام کو کرنے کا ارادہ تھا وہ ہم نے نہیں کیا یا کرنے میں چوکے ہیں۔ موسوی شریعت میں بتایا گیا ہے کہ جب آدمی نادانستہ خطا کرے تواس کی معافی کےلئے قربانی گذرانے (احبار۴اور ۵)مگرارادتاً گناہ کرنے والے کےلئے کوئی قربانی مقرر نہیں۔ پس خطا کے معنی کچھ ہلکے ہیں۔ ہم اپنے نیک ارادوں کو پورا کرنے میں قاصر ہوئے اورہم سے نادانستہ ایسے کام ہوئے ہیں جو اچھے نہیں۔

۲۔ راہِ راست سے بھٹکنا ۔ مثلاً زبور میں لکھا ہے(۱۱۹: ۱۷۶)" میں کھوئی ہوئی بھیڑ کو مانند بھٹک گیا ہوں"پھر یسعیاہ کے صحیفے میں آیا ہے(۵۳: ۶) " ہم سب بھیڑوں کی مانند بھٹک گئے"لوقا کی انجیل کے پانچویں باب میں گنہگار کو کھوئی ہوئی بھیڑ سے تشبیہ دی جاتی ہے اورپطرس کے پہلے خط میں

لکھا ہے (۲: ۲۵) " پہلے تم بھیڑوں کی طرح بھٹکتے پھرتے تھے مگر اب اپنی روحوں کے گلہ بان اور نگہبان کے پاس پھر آگئے" یہ بھٹکنا خطا سے ذرا اہم ہے کیونکہ خطا کار کوشش تو کرتا ہے اگرچہ کامیاب نہیں ہوتا پر جو راہ راست سے بھٹک جاتا ہے اس کا کامیاب ہونا ممکن ہی نہیں نیز بھیڑوں سے جو تشبیہہ دی گئی ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ جیسے بھیڑوں کا جھنڈ بے سوچ سمجھے اگلی بھیڑوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے ویسا ہی گنہگار اوروں کو کرتے دیکھتا ہے ۔ اس تشبیہ میں ماحول کا اثر دکھایا جاتا ہے۔

۳۔ خودسری۔" ہم نے اپنے اپنے دل کے منصوبوں اورخواہشوں کی زیادہ پیروی کی ہے" یسعیاہ نبی کے صحیفے کے ۵۳ویں باب میں مرقوم ہے کہ" ہم میں سے ہرایک اپنی راہ کو پھرا پر خداوند نے ہم سب کی بدکرداری اس پر لادی"۔ نیز زبور میں لکھا ہے کہ" میں نے ان کو ان کے دل کی بلاہٹ پر چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنے ہی مشوروں پر چلیں۔کاشکہ میرے لوگ میری سنتے اوراسرائیل میری راہوں پر چلتا' (زبور۸۱، ۱۲تا ۱۳) یرمیاہ کی زبانی یہ شکایت کی گئی "انہوں نے نہ سنا نہ کان لگایا بلکہ اپنی گردن کو سخت کیا"(۱۷: ۲۳) اورحزقی ایل سے خداوند نے فرمایا" میں تجھے۔۔۔ باغی قوم کے پاس جس نے مجھ سے بغاوت کی ہے بھیجتا ہوں"(خزقی ایل ۲: ۳)۔

لوقا کے پندرہویں باب میں مصرف بیٹے کی تمثیل میں گنہگار کو اُس خودسر بیٹے سے تشبیہہ دی جاتی ہے جو اپنی مرضی پر چلے اپنی راہ اختیار کرے اور اپنے باپ کے گھر کو چھوڑدے۔ چونکہ پاک کلام میں انسان کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ" دل سب چیزوں سے زیادہ حیلہ باز اورلا علاج ہے" اور کیونکہ کسی حال میں مخلوق کی مرضی کو خالق کی مرضی پر ترجیح دینا حماقت اورگستاخی ہے اس لئے اپنے منصوبوں اورخواہشوں کے موافق چلنا بُرا ہے۔

۴۔ حکم عدولی ۔ تمام بائبل میں یہ مانا جاتا ہے کہ خدا کے حکموں کے خلاف چلنا یا ان پر عمل نہ کرنا گناہ میں داخل ہے اوریوحنا کے پہلے خط میں لکھا ہے" گناہ شرع کی مخالفت ہے" اورنیز" ہر طرح کی ناراستی گناہ ہے" (۳: ۴، ۵، ۱۷) ہمارے اکثر گناہ یا تو اپنے پڑوسی کے خلاف کئے جاتے ہیں ۔ مثلاً چوری ، گھمنڈ ۔ قتل ، جھوٹی گواہی ۔ زنا وغیرہ یا

اپنے خلاف جیسے بعض قسموں کی حرامکاری، نشہ بازی ، خود کشی ، وغیرہ پر تمام گناہ خدا کی " جنابِ الٰہیٰ کے برخلاف" کئے جاتے ہیں۔

۵۔ بھلائی کرنے میں کوتاہی۔ یعقوب کے خط میں یوں آیا ہے " جو کوئی بھلائی کرنا جانتا ہے اورنہیں کرتا اس کےلئے گناہ ہے" (۴: ۱۷) چنانچہ دینِ عیسوی میں کوئی کام مستحب نہیں ہوسکتا" جس کے کرنے پر ثواب ہو اورنہ کرنے پر عذاب نہ ہو" لوقا کی انجیل کےبارہویں باب میں ایسے خادم کا ذکر ہے جو اپنے مالک کیلئے تیاری نہ کرے اوراس کی مرضی کےموافق عمل نہ کرے(۴۷آیت) پھر سیدنا مسیح کی بہت سی تمثیلوں میں نیکی میں کوتاہی کی طرف اشارہ ہے۔ امیر کےبارہ میں جو موت کے بعد عذاب میں پڑا یہ نہیں لکھاہے کہ بد چلن ، ظالم ، زانی یا قاتل تھا فقط یہ کہ " لعزرنام ایک غریب آدمی اُس کے دروازہ پر ڈالا گیا تھا" اوراس نے اس کی خبر گیری نہ کی(لوقا ۱۶: ۱۹ الخ)پھر متی کے پچسویں باب میں دیکھئے۔ بیوقوف کنواریوں میں کیا عیب نکلا کہ رد کی گئیں۔ انہوں نے شراب نہیں پی۔ دلہا دلہن کو گالی نہ دی ۔ صرف تیاری نہ کی ۔ ایک توڑے والے نوکر نے جس پر باہر اندھیرے میں ڈال دئیے جانے کا حکم ہوا کیا برائی کی؟ اپنے مالک کا روپیہ اپنے لین دین میں نہیں لگایا۔ غبن نہیں کیا۔ ناچ رنگ میں نہیں اڑایا، نہیں محض سستی کی ، اردو زبان میں گالی دینے کےلئے ایک محاورہ ہے جو بالکل بائبل کی تعلیم کے موافق ہے یعنی" کسی کوسخت سست کہنا" جوسست ہیں اُن کے کو پاک کلام شریر ٹھہراتا ہے۔ پھر جن پریہ حکم ہے" میرے سامنے سے اُس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اوراس کے فرشتوں کےلئے تیار کی گئی " اورجو" ہمیشہ کی سزا پائیں گے" ان کا کیا گناہ ثابت ہوگا" صرف یہ کہ انہوں نے اپنی دنیاوی زندگی میں مصیبت پانے والوں پر رحم نہ کیا۔

۶۔ بدی کرنا۔ " جو ہم کو کرنا روانہ تھا وہ ہم نے کیا ہے" اس کی وہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ ہرایک کو معلوم ہے کہ بدی کرنا گناہ ہے۔ بدی کی تقسیم یوں ہوسکتی ۔ (۱۔) اپنے پڑوسی کے خلاف۔ (۲۔) اپنے خلاف ، (۳۔) خدا کے خلاف ۔ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھنی چاہیے ۔ (احبار۱۹۔ ۱۸ وغیرہ) یعنی عملی طورپر اس کا فائدہ اپنافائدہ اوراس کا

نقصان اپنا نقصان سمجھنا چاہیے ۔ پس اس کا نقصان کرنا۔ اس کی حق تلفی کرنا وغیرہ ضرور گناہ میں داخل ہیں۔ رومیوں کے خط کے پہلے باب میں گناہ کا بہت ذکر ہے۔ تمام انبیاء نے حکم عدولی کرنے والوں کی ملامت کی۔ نیز عاموس نے نہ صرف ان اسرائیلوں کی ملامت کی جو موسوی شریعت کے خلاف چلتے تھے بلکہ دیگر قوموں کی بھی جو عام مروت کے خلاف چلتی تھیں۔ (عاموس پہلا باب اور دوسرا باب ۔ آیات ۲، ۳)۔

نئے عہدنامہ میں مثلاً متی کے پانچویں چھٹے اورساتویں باب میں موسوی شریعت کا روحانی مطلب زیادہ صفائی سے بیان کیا گیا ہے۔ حکم عدولی یہ ہے کہ جو کچھ انسان کو اخلاقی تعلیم ملتی ہے وہ اس کے خلاف کام کرے۔ یہ گناہ ہے۔

بعض علما گناہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ۔ مہلک اورہلکے اوروہ اس تقسیم کی بنیاد یوحنا کے پہلے خط میں پاتے ہیں۔ (۵: ۱۶اور۱۷) " اگر کوئی اپنے بھائی کو ایسا گناہ کرتے دیکھے جس کا نتیجہ موت نہ ہو تو دعا کرے۔ خدا اُس کے وسیلے سے زندگی بخشے گا۔ اُن ہی کا جنہوں نے ایسا گناہ نہیں کیا جس کا نتیجہ موت ہو۔ گناہ ایسا بھی ہے جس کا نتیجہ موت ہے۔۔۔۔۔ مگر ایسا گناہ بھی ہے جس کا نتیجہ موت نہ ہو" عبرانیوں کے خط میں بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر مسیح کو چھوڑ دیتے ہیں اُن کو ہم توبہ پر راضی نہیں کرسکتے۔ (عبرانیوں ۲:۲) پھر سیدنا مسیح نے خود فرمایا کہ جو آدمی روح القدس کے خلاف کفر بکے اُس کی معافی نہیں۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جب آدمی ایسے بگڑ جاتے ہیں کہ اچھے اچھے کاموں کو دیکھ کر اُن کو بُرا اورشیطانی کہتے اورسمجھتے ہیں تو اُن کا توبہ کرنا ممکن نہیں۔ نیز خداوند نے یہ بھی کا کہا کہ جو آدمی اوروں کو معاف نہیں کرتے ان کو خدا معاف نہیں کرے گا۔(دیکھو متی ۱۲۔ ۲۲سے ۳۲تک اورمتی ٦: ۱۵، ۱۸، ۲۱سے ۲۵تک)۔

بہر کیف اگرچہ کلامِ الٰہیٰ میں ایسے ایسے گناہوں کا ذکر ہے جن کا نتیجہ ابدی موت ہے توبھی اس کا اشارہ گناہوں کی مذکورہ بالا تقسیم کی طرف نہیں۔ عموماً سات مہلک گناہ مانے جاتے ہیں یعنی غرور، غصہ، حسد، زیادہ کھانا پینا، کاہلی

حرامکاری ، ان کے ماتحت اوربہت سے گناہ آتے ہیں جیسے غرور کے ماتحت شیخی بازی ، غصہ کے ماتحت قتل، زیادہ کھانے پینے کےماتحت نشہ بازی ۔ حسد کے ماتحت چوری غیبت وغیرہ وغیرہ۔ بے شك تمام گناہوں کی بدی اورتمام گناہوں کی گنہگاری برابر نہیں۔ جیسا تمام بُرے کاموں کا نقصان برابرنہیں مگریہ بات صاف ظاہر ہے کہ کلامِ الہیٰ ان فرقوں پر زورنہیں دیتامثلاً جس نے ساری شریعت پر عمل کیا اورایك ہی بات میں خطا کی وہ سب باتوں میں قصوروار ٹھہرا(یعقوب ۲: ۱۰)یعنی وہ شریعت کے خلاف کام کرنے والا اورگنہگارہے اوریہ نہ سمجھے کہ میرے اچھے کام بُرے کاموں کا معاوضہ ہوں گے۔پھر" لعنت اُس پر جو اس شریعت کی باتوں پر عمل کرنے کیلئے ان پر قائم نہ رہے"(استشنا ۲۶: ۲۷) پولوس نے گلتیوں کے خط میں اس کا یوں اقتباس کیا" جو کوئی اُن سب باتوں پر قائم نہیں رہتا۔۔۔ وہ لعنتی ہے"(گلتیوں ۳: ۱۰) پر استشنا کے اُس باب کے پڑھنے سے ظاہر ہے کہ اس نے مطلب نہ مروڑا۔پھر لکھاہے کہ " کتاب مقدس نے سب کو گناہ کے ماتحت کردیا"(۳: ۲۲) پھر" خدا نے سب کو نافرمانی کے ماتحت کریا تاکہ سب پر رحم فرمائے"(رومیوں ۱۱: ۲۳) کچھ فرق نہیں اسلئے کہ سب نے گناہ کیا اورخدا کے جلال سے محروم ہیں"(رومیوں ۳: ۲۲ اور۲۳)۔

حقیقت یہ ہےکہ مہلك اورہلکے گناہوں کا فرق انسان کے اعتبار سے ہے نہ کہ خدا کے اعتبار سے اورکلیسیا میں اس تقسیم کا لحاظ کرنا پڑتا ہے خاص کر اس وقت جب کسی مسیحی کی بابت یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آیا وہ کلیسیا کی شراکت میں رہ سکتا ہے یا نہیں۔

گناہوں کی ایك اورتقسیم یہ ہے۔ (۱۔) وہ گناہ جوآدمی جان بوجھ کر کرتا ہے۔(۲۔) وہ گناہ جو آدمی سے سہواً ہوتے ہیں۔ ایسے ایسے گناہ اس وقت ہوتے ہیں جب آدمی اچانك آزمائش میں پڑکر گناہ قبل اس کے کرتاہے کہ وہ غورکرکے پہچانے کہ کیا کرتا ہے اوربہت دفعہ اس وجہ سے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی عادت پڑجاتی ہے اوریوں اگرچہ فی الحال آدمی ارادتاً نہیں کرتا توبھی وہ پرانے گناہوں کا نتیجہ ہیں۔

مگردرحقیقت گناہ کا خاص مخرج۔ گویا اس کا دارالسطنت ۔ انسا ن کی مرضی ہے۔ اوّل انسان اپنے آپ کو

اپنی دنیا کا مرکز بناتا ہے چاہیے کہ انسان کی زندگی کا مرکز خدا ہو اور وہ " جو کچھ کرے سب خدا کے جلال کے لئے کرے" (۱کرنتھیوں ۱۰: ۳۱) لیکن اکثر ہم سب بہت سے کام اپنے فائدے کے واسطے اوراپنی خواہشیں پوری کرنے اوراپنے جلال کےلئے کرتے ہیں۔ اور نہ صرف بڑے بڑے گنہگار جیسے قاتل، چور، زانی، ظالم وغیرہ۔ بہت آسان ہے کہ واعظ وعظ کہتے وقت یہ بات مدِ نظر رکھے یا کم ازکم اس کو فراموش نہ کرے کہ لوگ اس کے وعظ کی تعریف کریں۔ یہ خواہش کہ لوگ" ہمارے نیک کاموں کو دیکھ کر" ہماری تعریف کریں بہت پھیلی ہوئی ہے۔ بعض اوقات بچپن ہی میں بچے یہ عادت اپنے ماں باپ اوراستادوں سے سیکھتے ہیں کیونکہ وہ" بڑا نام پیدا کرنا" بچے کا نصب العین بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔بہر حال بغیر ایسی شیطانی تعلیم کے ہم بآسانی خودبیں اورخود غرض بنتے ہیں ۔ہم سچ مچ اپنے درد اوراپنی خوشی ایسے محسوس کرتے ہیں جیسے اوروں کا درد اور اوروں کی خوشی محسوس نہیں کرسکتے۔ میرا درد سر مجھے بڑی صفائی سے معلوم ہوتا ہے ۔ میں زید کا درد سر محسوس نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ گناہ بھری دنیا میں بچہ بڑھتے بڑھتے سیکھتا ہے کہ اگر میں اپنے فائدے کا طالب نہ رہوں گا تو اکثرمیری حلق تلفی ہوگی۔ یوں رفتہ رفتہ یہ عادت پڑجاتی اورپکی ہوجاتی ہے کہ ہم ہرایک بات کے بارہ میں سب سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ اس کا مجھ پر کیا اثر ہوگا۔ اوربار بار اوروں کے حقوق اور فائدہ اورخدا کی مرضی بالکل بھول جاتے ہیں۔ یہ دین میں بھی آجاتا ہے جب ہم سوچتے ہیں کہ ہم خود کسی نہ کسی طرح اپنی نجات کماسکتے ہیں یا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری نجات سب چیزوں سے زیادہ ضروری ہے یا مذہبی فرائض ادا کرتے وقت اپنے آپ کو نیک اورخدا کی محبت کے لائق سمجھتے ہیں۔ بہت کچھ مذہبی کام انسان کے جلال کےلئے کئے جاتے ہیں نہ خدا کے جلال کےلئے۔

ایسے شخص کی مرضی جو اپنی زندگی کا خود مرکز ہے خدا کی مرضی کے ماتحت نہیں اوراس کے تمام کام گناہ آلودہ ہوتے ہیں کیونکہ خدا کے جلال کیلئے نہیں کئے جاتے ممکن ہے کہ وہ کوئی بڑا گناہ نہ کرے بہرحال گنہگار ہے۔

اس کا ایک نام غروریا گھمنڈ ہے۔ جب انسان بجائے خدا کی مرضی اورحکموں کے اپنی مرضی اوراپنے خیالات کو اپنے کاموں کی کسوٹی بناتا ہے تو یہ غرور ہے۔ یہ خیال جو بہت پھیلا ہا ہے کہ اگر زیادہ تعلی ہوگی اگرملک کی آزادی ہوگی۔ اگر اچھے قانون بنائے جائیں۔ اگراچھا نظام کیا جائے تو انسان اچھے بن جائیں گے نہ صرف خام اورتواریخ کے سبقوں کے خلاف ہے بلکہ غرور سے بھرا ہے ۔ جیسا بیسوں دفعہ غلط ثابت ہوا ہے وایسا ہی پھر غلط ثابت ہوگا۔ یہ سب باتیں اچھی بلکہ ضروری ہیں تو بھی بنی آدم اپنی کوششوں سے نیک نہیں بن سکتے بلکہ یہ خیال کہ اس طرح نیک بن سکتے گناہ کا جوہر ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کاموں کا مخرج ہماری ہی مرضی ہوتی ہے ۔ گنہگار کی حالت بُری ہے کیونکہ بُرے درخت سے اچھے پھل نہیں نکل سکتے (متی ۷: ۱۸) ہم سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اوریہ بُرا ہے ۔ مگر خاص بات یہ نہیں کہ ہم سے گناہ ہوتےہیں بلکہ یہ کہ ہم گنہگارہیں۔ ممکن نہیں کہ گنہگار سے گناہ نہ ہوں اورہر گناہ کا نتیجہ یہ ہے کہ گنہگار اوربھی زیادہ گناہ آلودہ طبیعت رکھتا ہے۔

پس گناہ یہ ہے کہ ہم خدا کی مرضی اورحکموں کو چھوڑ کر اپنی مرضی پر چلتے رہتے ہیں جس سے ہم خدا سے دور ہوجاتے ہیں۔

بعض لوگوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ گناہ کی جڑ مادہ ہے۔ یہ خیال نہ صرف بائبل کی تعلیم کے خلاف ہے کہ خدا نے خلقت کو اچھا پیدا کیا(پیدائش ۱: ۲۵)۔ خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے) بلکہ اس کا بات کا سبب نہیں بتاسکتا کہ غرور سب سے بڑا گناہ کیوں ہے۔بہت سے گناہ ہادی اورآسمانی نہیں۔ پولوس نے لفظ جسم کو توضروراستعمال کیا۔ مگر ذرا غورکرنے سے ظاہر ہے کہ پولوس کی اصطلاحات میں جسم سے نہ صرف مادی بدن مراد ہے مثلاً وہ کہتا ہےکہ " جسم کے کام توظاہر ہیں یعنی حرام کاری، ناپاکی، شہوت پرستی، بُت پرستی ، جادوگری، عداوتیں، جھگڑا، حسد، غصہ، تفرقے، جدائیاں، بدعتیں، بغض، نشہ بازی ،ناچ رنگ " لیکن جن الفاظ

کے اوپرلکیر ہے وہ ایسے ایسے گناہوں کے نام ہیں جو کسی قدر یا بالکل مادی اور(عام بول چال کے موافق) جسمانی نہیں۔

ڈاکٹر ٹیننٹ صاحب نے یہ دکھانا چاہا کہ ارتقاء کے مسئلے سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ یوں پیدا ہوتا ہے کہ حیوانی کام جو حیوان کےلئے درست ہیں انسان کے خودمختاری اورنیك وبد کی پہچان حاصل کرنے کے بعد گناہ کے باعث ہوئے کیونکہ انسان بُرے طورپر ، غلط موقع پر ، زیادتی کےساتھ کرنے لگا اوریہ گناہ ہے۔ بے شك اس میں کچھ حقیقت ہے۔ ہماری جسمانی خواہشیں سب اچھی بلکہ ضروری ہیں لیکن اُن کا غلط استعمال گناہ ہے۔ پرڈاکٹر ٹیننٹ صاحب نے یہ نہیں دکھایا کہ کیا سبب ہے کہ سب سے خراب اور مہلك گناہ روحانی ہیں مثلاً غرور، بہر حال یہ ماننا پڑتا ہے کہ جب خدا نے انسان کوخود مختاری اورقوتِ ارادہ بخشی تو انسان نے اس بخشش کو غلط طورپر استعمال کیا۔گناہ کا مرکز انسان کی مرضی ہے۔

آزمائش گناہ نہیں بلکہ گناہ کا موقع ۔ یہ بھی کہنا درست ہے کہ آزمائش نیکی کا بھی موقع ہے جیسے (امتحان فیل ہونے کا بھی موقع ہے اور پاس ہونے کا بھی۔ آزمائش اکھاڑا ہے جس میں کشتی لڑنے والا یا جیت جائے یا ہارجائے۔ اس دنیا میں " ٹھوکروں کاہونا ضرور ہے"(متی ۱۸: ۷) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان گرنے پر مجبور ہے۔

" تم کسی ایسی آزمائش میں نہیں پڑے جو انسان کی برداشت سے باہر ہو اورخدا ۔۔۔۔ تم کو تمہاری طاقت سے زیادہ آزمائش میں نہ پڑنے دے گا بلکہ آزمائش کے ساتھ نکلنے کی راہ بھی پیدا کردے گا"۔ اس میں شك نہیں کہ بعض اوقات اچھے لوگوں کے بھی دلوں میں ایسی اُمنگیں ہوتی ہیں جن سے وہ شرماتے ہیں۔ بہر حال اگر وہ فوراً اُن خیالوں کو دُعا کے ساتھ دورکرنے کی کوشش کرتے ہیں تو گناہ نہیں۔ گناہ اس وقت پیداہوتا ہے جب آدمی ایسی باتوں پر خوشی سے غور کرتا ہے اورغالباً ایسے غورسے بُرے فعل بھی پیدا ہوں گے۔ پر سیدنامسیح کوبھی شیطان نے آزمایا(متی ۴: ۱تا ۱۱تك ۔ لوقا ۴: ۱سے ۱۳تك)۔ اورلکھا ہے کہ " وہ سب باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا توبھی بے گناہ رہا"(عبرانیوں ۴: ۱۵)۔ بے شك ایك فرق ہے کیونکہ ہمارے خداوند کےدل میں چورنہ تھا۔

آزمائش کے وقت ہم اکثراس سبب سے کمزورنکلتے ہیں کہ ہم نے باربارگناہ کیا پراُس نے کبھی گناہ نہ کیا۔

یادرہے کہ پاک کلام میں لفظ آزمائش دومعنوں میں آتاہے۔ اوّل مشکل میں پڑنا جس سے انسان شاید گناہ کرسکے۔ مثلاً یعقوب ۱: ۲۔ اورغالباً دعائے ربانی میں آزمائش کے یہ معنی ہیں)دوم گناہ کی رغبت مثلاً یعقوب ۱: ۱۳۔ سے ۱۶تک)۔

پھر گناہ نہ صرف نیکی کی کمی ہے اگرچہ یہ گناہ میں داخل ہوسکتاہے (یعقوب ۴: ۷) کیونکہ یہ لاعلمی اورانسان کی محدود حالت سے نکل سکتاہے اوریہ حالتیں بے قصوری کے برعکس نہیں۔ نیز اس بات کا انکارکرنا چاہیے کہ گناہ اوراخلاقی بدی نیکی کی راہ میں ضروری منزل ہیں کہ گویاخدا نے یہ انتظام کیاکہ گناہ کی غلاظت سے ہوکر نیکی کےمنزل مقصورپرپہنچناامر ضروری ہے۔ اس خیال کی ذرا بھی بنیاد بائبل میں ملتی نہیں۔

آخرکارہم اس بات کی طرف متوجہ ہوں کہ نہ صرف الگ الگ اشخاص گنہگارہوسکتے ہیں بلکہ اقوام بھی ۔ یہ پرانے عہدنامہ میں بہت صفائی سے سکھایا جاتاہے کیونکہ باربار اسرائیل کے گناہ کا ذکرآتاہے۔ "یربعام کے گناہ جن سے اس نے اسرائیل سے گناہ کروایا" دمشق کے تین بلکہ چار گناہوں کے سبب۔۔۔"(۱سلاطین ۱: ۳۱۔ عاموس ۱: ۳)۔

قوموں کے گناہوں کا جو ہر(الگ الگ آدمیوں کے مانند) خود غرضی خودبینی، خودسری ہے کیونکہ جب کسی ملک میں تمدن یہاں تک بڑھ جاتاہے کہ اس میں باقاعدہ انتظام ہوتاہے تو شخصی خوبیاں اور برائیاں نظرآنے لگتی ہیں۔ ہر ملک میں جب تک خود مختاربادشاہ رہتاہے وہ اپنی مرضی پر چلتاہے اورجب جمہوری سلطنت ہونے لگتی ہے خواہ کلی ہو جیسے بہت سے ملکوں میں یا برطانیہ کی مانند بادشاہ کے ساتھ ہو تو ملکی مجلس اپنے وزیراعظم کےذریعہ سے دیگروزیروں کے ساتھ ایک شخص کی طرح کام کرتی رہتی ہے۔ اورایک خاص بات نظرآتی ہے۔ ایک ہی شخص کا رعب اگرچہ بادشاہ بھی ہو اتنا نہیں جتنا بڑے ملک کی سرکارکا ہوتاہے اوررعایا عموماً اپنے ملک کی سرکارکےحکموں کواُس وقت بھی مانتی ہے جب شخصی خیالات اورمرضی کے

خلاف ہیں۔ رعایا کا ہرآدمی چند ہی سال تک زندہ رہتا ہے پر ملک سینکڑوں برس تک قائم رہتا ہے۔ مثلاً قسطنطنیہ کی رومی سلطنت ایک ہزاربرس سے زیادہ قائم رہی۔ انگلستان میں سلسلہ واربادشاہ ہزاربرس سے زیادہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے رہے وغیرہ۔ اس کے سبب سے بھی ملکی سرکارکا دبدبہ زیادہ ہوتا ہے۔

قوموں کی خود غرضی روحانی گناہ ہے اوریہ اس بات سے ظاہر ہے کہ قومیں اپنے اختیاراورزوربڑھانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ غرورظاہر کرتی ہیں۔ دوسری قوموں کو نیچ جانتیں۔ ایک دوسری کودھوکا دیتیں اوردعویٰ کرتی ہیں کہ جو ہم چاہیں وہی ہوجائے۔ جنگ کے وقت طرفین کے مضمون نگاراوراسپیچ دینے والے ہمیشہ دعویٰ دارہوتے ہیں کہ حق ہماری طرف ہے۔ کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ غنیم نے پہلا حملہ کیا یا ہمارے ساتھ بے وفائی یا ظلم کیا یا یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے بہترین ( ) کوپھیلانا چاہتے ہیں اورشائستگی کے خواہاں ہیں۔ نیزیہ باتیں اُن کے اندرپارٹیوں ، انجمنوں اورذاتوں میں نظرآتی ہیں۔ فی زمانہ پوری دنیا ان برائیوں سے تکلیف اٹھارہی ہے۔

پھر اکثر ملکی سرکاریں اپنا رُعب اوراختیاریہاں تک بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں کہ رعایا سے ایسی فرمانبرداری طلب کرتی ہیں جو غلامی میں داخل ہے اوراپنے آپ کیلئے خدا کی جگہ لے لینی کی کوشش کرتی ہیں۔کاؤورنے جواطالیہ کے بڑے وزیر گذرے ہیں یہ کہا" اگرہم اپنےلئے وہ کام کرتے جو ملک کےلئے کرتےہیں توکیسے معاش ہوتے" ۔ ایک بحری ڈاکو نے سکندراعظم سے جس نے اسکو پکڑا یہ عرض کیا" چونکہ میں ایک ہی چھوٹا جہازلیکرلوگوں کوتکلیف دیتاہوں اس لئے میں بحری ڈاکو کہلاتاہوں۔ آپ جو بڑا بیڑا لیکر یہ کام کرتے ہیں فاتح کہلاتے ہیں"۔

غرض انسان کے گناہ۔ مہلک اورہلکے ۔ پوشیدہ اورعلانیہ جسمانی اوروحانی شخصی اورملکی ۔ سب کا مخرج اورجوہریہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنا خدا بناتا اوراپنی مرضی کو خدا کی مرضی پر ترجیح دیتا ہے یہاں تک کہ راہِ راست سے بھٹک جاتا۔ اپنے دل کی ہٹ پرچلتا۔ نیک کاموں

کوترک کرکے بدی کرتا اورخدا کے پاک حکموں کے خلاف چلتا ہے۔

باب پنجم

" موروثی گناہ" فطری بدی

خادم نےاس باب کے سرنامہ کو اس طور پر اس لئے لکھاکہ الفاظ موروثی گناہ انلگسکانی کلیسیا کی دعائے عام کی کتاب میں استعمال ہوئے ہیں اور عموماً استعمال ہوتے ہیں۔بہر حال انگریزی الفاظ کا ترجمہ اورطرح سے بھی کیا جاسکتا ہے مثلاً فطرتی گناہ، طبعی گناہ ، ذاتی گناہ، لفظ موروثی میں نقص یہ ہےکہ اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ " باپ دادا نے کچے انگور کھائے اوراولاد کےدانت کھٹے ہوئے" اور اس مثل کو حزقی ایل نبی نے جھٹلایا(حزقی ایل ۱۸: ۱)۔سائنس داں بھی کہتے ہیں کہ ماں باپ کے کئے ہوئے کاموں کا اثراُن ہی پر پڑتا ہے نہ کہ ان کی اولاد پر۔ بہرکیف اگریہ نہ ماناجائے کہ " موروثی گناہ" سے صرف اتنا مراد ہے کہ ہرآدمی اپنے باپ دادا کی طرح گناہ کی طرف مائل ہے توچنداں حرج نہیں۔

انگلسکانی اورمیتھوڈسٹ کلیسیاؤں میں مانا جاتا ہے کہ فطرتی گناہ نہ صرف یہ ہے کہ انسان آدم کے نقش قدم پر

چل کر برائی اورخدا کی حکم عدولی کرتا ہے بلکہ یہ کہ ہرانسان کی ذات بگڑی ہوئی ہے یہاں تک کہ اُس میں کوئی راستبازی قائم نہیں رہ سکتی بلکہ وہ بدی کی طرف مائل ہے اورنیکی کرنے سے قاصر۔ بعض کلیسیائیں یہ بڑھادیتیں ہیں کہ اس فطری میلان کے سبب سے انسان سزا کے لائق ٹھہرتا ہے۔

لفظ گناہ بہت موزوں نہیں کیونکہ یہ فطرتی یاطبعی میلان جس کا ہم بیان کررہے ہیں انسان کا قصورنہیں کیونکہ وہ اس کو پیدائش میں گویا ورثتاً ملتا ہے اورجس کام یا حال کے ہم خود مرتکب نہیں اورجس سے بچ نہیں سکتے اس کو گناہ کہنا درُست نہیں۔ نیزہم محض اُسی کے سبب سزا کے لائق نہیں ٹھہرسکتے جب تک کہ خود گناہ نہ کریں پرچونکہ ہرایک انسان گناہ کر بیٹھتا ہے اس لئے بہت جلد سزا کے لائق ٹھہرتا ہے۔بہر حال فطرتی بدی کی تعریف یوں بڑھا دینا مبالغہ ہے۔

بعض اوقات معترض کہتے ہیں کہ اگرآدم وحوا کی بابت جو کچھ پیدائش کے تیسرے باب میں لکھا ہے تواریخ نہیں بلکہ تمثیل ہے تو مسیحی دین کی ساری بنیاد کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ مگرایسا خیال درحقیقت بہت خام ہے کیونکہ نجات کی ضرورت اس بات پر مبنی نہیں کہ دنیا میں گناہ کیونکر داخل ہوا بلکہ اس پر کہ گناہ ہرجگہ پھیلا ہے۔

اس جگ میں ہیں پاپ گھنیرے

ہرانسان راستبازی میں قاصر اورگناہ میں مبتلا رہتا ہے جب تک کہ اس کو کوئی نہ بچائے۔ چاہے اس کا کوئی بھی سبب بتایا جائے حقیقت ایسی ہی ہے اورجو دین یا مذہب یافلسفہ اس کو نہیں مانتا وہ غلط ٹھہرتا ہے اورانسان کی بہتری کے لئے جو انتظام کیا جائے جب تک ایسا فطری بدی کا لحاظ نہ کرے کامیابی تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ انسان ایسا نہیں جیسا ہونا چاہیے بلکہ اُس حالت سے بہت دور ہے جس کے لئے خدا نے اُسے پیدا کیا۔

گناہ کی عالمگیری کی کیا وجہ ہے؟ پیدائش کی کتاب میں دوشخصوں یعنی آدم اورحوا کا ذکر ہے جو تمام بنی آدم کے پہلے ماں باپ تھے مگر ان کے دوناموں کے معنی درحقیقت شخصی نہیں اورپیدائش کے دوسرے اورتیسرے بابوں میں مترجم بعض اوقات انسان یاآدمی لکھے اوربعض اوقات آدم

کیونکہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ عبرانی لفظ کے معنی کب شخصی ہیں(اسی طرح سے حوا کے معنی زندہ یا زندگی کے ہیں)۔

کیاہم کو سمجھنا چاہیے کہ انسان بنا توایک قوم بن گئی یایہ کہ دوہی انسان بنے۔کوئی نہیں کہہ سکتا۔ سائنس کے عالم جو قریب قریب سب ارتقاء کے ماننے والے ہیں فیصلہ نہیں کرسکتے کیونکہ بعض کہتے ہیں کہ دویا تھوڑے سے انسان بنے اوربعض کہتے ہیں کہ بہت سے انسان بنے۔

مسئلہ ارتقاء یہ بتاتا ہے کہ تمام موجودہ جاندار(نباتات وحیوانات) کے انواع اقسام رفتہ رفتہ پشہا پشت بدلتے بدلتے بن گئے یہاں تک کہ سب کے سب نہایت سادہ جانداروں اورپودھوں سے بنے۔ انسان کا جسم حیوانی ہے۔ اورارتقاء سکھاتا ہے کہ انسان جسمانی طورپر رفتہ رفتہ ایسے حیوان سے جو بندر سے ملتا جلتا تھا بن گئے اورپھر اس کو نیک وبدکی پہچان ان کو حاصل ہوئی ۔ ارتقاء کی رو سے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا ان تمام حیوانوں کو انسانی لیاقت اور( ) یک لخت مل گئیں یا صرف تھوڑوں کو جوان باتوں کے سبب سے انسان ہوئے(دیکھو پیدائش ۲۔ ۷۔ ۱۔ ۲۷)(نوٹ ارتقاء تخلیق کے طریقے کا ایک بیان ہے مسئلہ تخلیق کو جھٹلاتا نہیں)۔ ارتقاء کے رو سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جب انسان شروع میں نیک وبد پہچاننے لگے توبدی کو چُن لیا۔اس طرح دنیا میں گناہ آموجود ہوا۔پھر معلوم کرنا کہ آیا گناہ وراثتہً پہلے انسانوں کی اولا د میں آگیا یااُن کی اولا د ماں باپ کی برائی دیکھ کر آپ بچپن ہی سے اُن کے مقلدہوئی مشکل ہے یا شاید ناممکن۔ بہر حال ارتقاء کےلحاظ سے انسان بگڑا ہے کیونکہ جیسا ہونا چاہیے تھے وہ ایسا نہ بنا۔

ایک بات غورطلب ہے کہ جب بچہ بات بھی نہیں کرسکتا تو وہ اشارہ کرسکتا ہے اورایسی حالت میں جب صرف مہربان اورمحبت رکھنے والے ماں باپ سے سابقہ ہوتا ہے اس طورپر گناہ کرتا (کیونکہ شیرخوارکا غصہ اکثر ناحق ہوتا ہے) اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ فطرتی برائی سچ مچ موروثی ہے۔

بہرکیف ہم انسان کی یگانگی کو فراموش نہ کریں۔ شلائر ماخر نے لکھا " ہر ایک میں گناہ سب کا کام ہے اورسب میں گناہ ہرایک کا کام ہے۔" یعنی ہمارا شخصی گناہ اوروں کے گناہ

کا نتیجہ اوراُس سے ملاہوا ہے۔نیز تمام بنی نوع انسان کا گناہ اورالگ گناہوں کا مجموعہ بھی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ فرض کیجئے کہ میں اپنے روئیے سے کسی کمپنی میں حصہ خریدلوں۔ مجھے اُمید ہوگی کہ کمپنی کے مینجر مزدوروں پر ظلم نہ کریں گے مگرمجھے کیا معلوم اوراس میں مجھے کیا اختیار ہے؟یا میں کسی ہوٹل میں جس میں شراب بکتی ہے ٹھہرنے پر مجبورہوں۔ ممکن ہے کہ شراب سے جو نفع ہوتا ہے اُسی کے سبب سے کمرہ کا کرایہ کم ہو۔یہاں تک کہ شراب خوروں کے متوالے ہونے سے مجھے شخصی فائدہ حاصل ہے۔ نیز ہر زمانہ ہرملک ہر طبقے کے لوگ کسی نہ کسی خاص برائی میں عموماً پھنسے رہتے ہیں۔ جب ہم اور زمانوں ،اورملکوں اور قوموں کےلوگوں پر غورکرتے ہیں توہم کو تعجب ہوتا ہے کہ وہ ایسے ایسے کام کرتے تھے یا کرتے ہیں جوہماری نظر میں بہت بُرے ہیں پر وہ خود اس کو معلوم نہیں کرتے ۔ ایک زمانہ تھا کہ مسیحی لوگ غلامی میں کوئی عیب نہیں دیکھتے تھے۔ پادری جان نیوٹن اُس وقت سچے مسیحی ہوئے جب وہ اپنے جہاز میں جس کے وہ اس وقت ناخدا تھے حبشی غلاموں کو امریکہ لے جاتے تھے۔ وہ غلام دغا سے پکڑے گئے اوراُن کا حال قابل افسوس تھاپر نیوٹن کویہ کبھی نہیں سوجھا کہ اس کوافریقہ تک لوٹ کر اُن کو آزاد کردینا چاہیے۔ کوئی ملک کوئی زمانہ کوئی پیشہ ایسے اندھے پن سے بری نہیں۔ ہم اس دنیا میں گناہ میں پھنسے میں ہیں اور ہمارے کام کسی نہ کسی قدر گناہ آلودہ ہیں۔

پادری پروفیسر این ۔ اپی ۔ ولیمز صاحب نے بُرائی کا ایک مفید خلاصہ لکھا ہے جو حسب ذیل ہے:

۱۔ خدا قدرت، محبت اور راستی کے لحاظ سے بے عیب اورلاانتہا ہے۔چنانچہ خلقت بے عیب تھی۔

۲۔ پس بدی کا مخرج مخلوق کی مرضی ہے۔

۳۔ انسان شروع ہی میں مثل شیرخواربچے کے اخلاقی اور عقلی حیثیت سے کمزور۔ نامکمل اورلاعلم تھا پر قوتِ ارادہ سے محروم نہ تھا۔

۴۔ جب انسان نے اخلاقی باتیں پہچانیں توبہت سی باتوں میں بُرای کی چنی۔

۵۔ اُس وقت سے ہم ذاتی طورپر بدی کی طرف مائل ہیں۔

۶۔ بدی کی طرف یہ موجودہ میلانِ قوت ارادہ کی کمی یا کمزوری کا نتیجہ ہے۔

۷۔ یہ کمزوری جس کے باعث بنی نوع انسان بدی میں پھنستے ہیں انسان کو وراثتہً سلسلہ وارحاصل ہوتی ہے۔

آپ یادرکھیں کہ جو خواہشیں فطرتاً ہم میں پیدا ہوتی ہیں وہ نہ نیکی میں داخل ہیں نہ بدی میں۔ اُن کا اچھا یا بُرا ہونا صرف ان کے استعمال پرموقوف ہے۔ خود غرضی سے، بےقاعدگی سے ،زیادتی سے، خدا کے حکموں کےخلاف ان خواہشوں کو پورا کرنا گناہ ہے۔ وہ خواہشیں خود گناہ میں داخل نہیں۔ پربُرائی اسی وجہ سے جاری رہتی ہے اورہر پشت کو گویا وراثتہً ملتی ہے کہ بہت سے افراد اپنی خوشی یا اپنی مرضی یا اپنی عقائد سے اپنی فطرتی خواہشوں کو بُرائی کرنے کا موقع بنایا کرتے ہیں۔

جو ارتقاء کو مانتے ہیں اورآج کل اکثر پڑھے لکھے آدمی یا کم ازکم جن آدمیوں نے دورِحاضرہ کی تعلیم خاص کر سائنس کی تعلیم پائی ہے ارتقاء مانتے ہیں اُن میں بعضوں نے یہ خیال کیا کیا کہ کچھ ایسے ایسے گناہ ہیں جو گناہ بھری دنیا میں دنیاوی شخصی زندگی کےلئے مفید نظرآتےہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ خاصکر غیر شائستہ لوگوں کے درمیان ایسے گناہ کے مرتکب زیادہ اوراچھا کھانا کھاسکیں گے اوربچوں کی بہتر پرورش کریں گے جس سے اُن کے بچوں کو زیادہ طاقت حاصل کرنے کا موقع ملے اوراس سے گناہ کا بڑھنا آسان تھا۔ نہ فقط ان کی زیادہ اولا سنِ بلوغت تک پہنچی گی بلکہ دنیا کے لحاظ سے یہ لوگ زیادہ کامیاب نظرآئیں گے اوراُن کا بُرا اثر زیادہ لوگوں پرپڑے گا۔ یہ ممکن ہے۔ پرحقیقت میں جب دنیا میں گناہ داخل ہوا تو اس کےپھیلنے کی خاص وجہ ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے سبب سے سب کی تربیت بگڑ گئی کیونکہ سب بچپن ہی سے گناہ دیکھتے رہتے تھے اورممکن نہ تھا کہ خود گنہگارنہ بنتے۔

اب یہ سوال لازم آتا ہے کہ مقدس پولوس نے اس کی بابت کیا سکھایا۔ خاص حوالے یہ ہیں رومیوں کا خط پانچویں

باب کی بارہویں آیت سے اکیسویں آیت تک اورکرنتھیوں کا پہلا خط پندرہویں باب کی ذیل کی آیات ۲۱۔ ۲۲۔ ۴۵۔

پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ پولوس کا یہ عقیدہ تھاکہ گناہ ہی موت کا باعث ۔ پر یہ بات نظر اندازنہ کرنا چاہیے کہ بہت دفعہ جب پولوس رسول موت کا ذکرکرتا ہے تو زیادہ تر روحانی موت کا خیال کرتا ہے اورممکن ہے کہ جہاں پولوس نے لکھا" آدم میں سب مرتے ہیں" (۱کرنتھیوں ۱۵: ۲۲) یا"ایک شخص نے گناہ کے سبب سے موت نے اُس ایک کے ذریعہ سے بادشاہی کی" نہ صرف جسمانی موت کا ذکرکرنا چاہا بلکہ اُس روحانی موت کا بھی جوگناہ کے سبب سے دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اورجس کی وجہ سے موت ڈراؤنی ہے۔ جیسا اُس نے یہ بھی لکھا" موت کا ڈنک گناہ ہے" (۱کرنتھیوں ۱۵: ۵۶)بہر کیف اس میں شک نہیں کہ پولوس موت کوگناہ کا نتیجہ مانتا تھا روحانی بھی اورجسمانی بھی۔ اس میں شک نہیں کہ جوحیوان (ازروئے ارتقا) پہلے انسانوں کے باپ دادا تھے وہ سب مرتے تھے۔ پرجانورکی موت اس کےلئے مرنے سے پہلے کوئی بوجھ یاخوف کا باعث نہیں ہوتی کیونکہ وہ ان موجودہ زمانے ہی کا خیال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اگرانسان گناہ نہ کرتے تواُن پر موت کا تسلط نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مسئلہ میں پولوس نے اپنے زمانہ کے یہودیوں کے خیالوں کو یوں ہی قبول کیا۔ فی زمانہ ایک عالم یعنی لوئس صاحب نے گمان کیا درحقیقت موت گناہ کا نتیجہ ہے پر اُن کا خیال پورے طورپر معلوم کرنا کسی قدرمشکل ہے کیونکہ اگرچہ ایک کتاب" دکھ کا معمہ"۔ میں آپ اس بات کے معتقد معلوم ہوتے ہیں کہ بغیرگناہ کئے انسان نہ مرتے توبھی ایک اورکتاب" سیارے میں سے " آپ یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ موت کا خوف اورموت کی خرابیاں ہی گناہ کے نتیجہ ہیں۔ الغرض یہ تو ضرورسچ ہے کہ موت کی تمام برائیاں گناہ سے پیداہوئی ہیں اورہوتی ہیں۔

دوباتیں غورطلب ہیں۔ اوّل مذکورہ بالا مضامین میں پولوس کا خاص مقصد یہ ہے کہ آدم پر مسیح کی فوقیت دکھائے۔

" جب کیونکہ کہ جب آدمی کے سبب سے موت آئی توآدمی ہی کے سبب سے مردوں کی قیامت بھی آئی۔اورجیسے

آدم میں سب مرتے ہیں ویسے ہی سیدنا عیسیٰ مسیح میں سب زندہ کئے جائیں گے ۔" ، " پہلا آدمی یعنی آدم زندہ نفس بنا۔ پچھلا آدم زندگی بخشنے والی روح بنا" (۱کرنتھیوں ۱۵: ۲۱تا ۲۲ اور ۴۵)۔

نیز" جب ایک شخص کے گناہ سے بہت سے آدمی مرگئے تو پروردگار کی مہربانی اوراس کی جو بخشش ایک ہی آدمی یعنی سیدنا عیسیٰ مسیح کی مہربانی سے پیدا ہوئی بہت سے آدمیوں پر ضرورہی افراط سے نازل ہوئی" کیونکہ جس طرح ایک ہی شخص کی نافرمانی سے بہت سے لوگ گنہگار ٹھہرے اسی طرح ایک فرمانبرداری سے بہت سے لوگ دیانتدار ٹھہریں گے (رومیوں ۵باب ۱۵ اور ۱۹آیت)۔

اس سے یہ ظاہر ہے کہ پولوس نے اس بات کی تشریح کرنے کی غرض سے نہیں لکھا بلکہ اس غرض سے کہ مسیح اورنجات کی تحسین کرے۔ چنانچہ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ مذکورہ بالاآیات میں ہم گناہ کی عالمگیری کی بابت مقدس پولوس کا پورا خیال پاسکتے ہیں۔ مبحث اورہی ہے۔

دوم۔ پولوس رسول نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ ہم آدم سے گناہ کو وراثتہً حاصل کرتے ہیں۔ بہت سے عالموں نے یہ لکھا مگر جوکچھ انہوں نے لکھا وہ ایک نتیجہ ہے جو اُنہوں نے پولوس کے الفاظ سے نکالا ۔ پولوس فقط یہ لکھتا ہے کہ آدم یعنی پہلے انسان کے گناہ کے سبب سے گناہ تمام بنی نوع انسان میں پھیل گیا۔ رومیوں کے پانچویں باب کی ۱۴ویں آیت میں یوں آیا ہے" آدم سے لیکر موسیٰ تک موت نے اُن پر بادشاہی کی جنہوں نے اس آدم کی نافرمانی کی طرح ۔۔۔۔گناہ نہ کیا تھا" جن الفاظ پر لکیر ہے وہ اس مسئلہ کے موافق نہیں کہ ہم گناہ وراثتہً حاصل ہوا ہے۔

پولوس آدم اورمسیح ہرایک کو ہمارا نمائندہ ٹھہراتا ہے ۔ انسانی زندگی میں نمائیندگی بڑی چیزہے۔ جو ہماری نمائندگی کرتے ہیں اُن کا ہم پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً اگرآپ کے شہر کی میونسپل بورڈ جس میں آپ کے نمائندے بیٹھتے ہیں اچھاکام کرتی ہے توشہر کی سڑکیں ہموار اورصاف ہوں گی۔ اسکول اچھی طرح سے چلیں گے وغیرہ وغیرہ ورنہ خراب ہوں گے۔ چاہے آپ نے موجودہ نمائندوں کی طرف

ووٹ دیا نہ دیا۔ ہٹلر جرمن لوگوں کا نمائندہ تھا اوراُس نے اُن کو کیسی بربادی میں مبتلا کردیا۔ ان کو بھی جو اس کے خلاف تھے۔ چرچل صاحب کے خلاف بہت سے آدمیوں نے ووٹ دیا توبھی جو فائدے خدا کے فضل سے اُن کے ذریعہ سے ملک کو حاصل ہوئے وہ لوگ بھی ان میں شریک ہوئے۔ نہ توہم نے اپنے پہلے ماں باپ کو چنا اورنہ خداوند مسیح کولیکن دونوں کےکاموں کا ہم پر اثر پڑتا ہے ہاں۔ ہم اب سیدنا مسیح کو چن سکتے ہیں تاکہ وہ ہمارا مددگاراورمنجی ہو۔

یہ غورطلب بات ہے کہ تمام پُرانے عہدنامے میں پیدائش کے تیسرے باب کے بعدآدم کے گناہ کا پھر ذکرنہیں۔ مسیح کے زمانہ میں اوراُس سے تھوڑے سال قبل یہودی علماء اس پر غورکرنے لگے پر الہامی مکتوبات میں اس کا ذکر نہیں (نوٹ)۔ بعض مترجم ہوشیع کی کتاب کے چھٹے باب کی ساتویں آیت میں آدمیوں کی جگہ آدم لکھتے ہیں مگر لفظ آدمیوں بہترمعلوم ہوتا ہے)۔

انسان نے گناہ کرنے سے کیا کیا باتیں کھودیں؟ اس بات پر بہت بحث ہوئی ہے۔ کلیسیائے روم کی تعلیم یہ ہےکہ انسان کی حالت گناہ کرنے سے پہلے یہ تھی۔ خدا نے اس کی ذات کو ایک خاص روحانی بخشش سے بڑھادیا اورکامل کیا۔ گناہ کرنے سے انسان نے اپنی ذات تونہ کھوئی پرخدا کی روحانی بخشش سے محروم ہوا۔ عموماً پرائیسٹنٹ علماء نے یہ خیال کیاکہ انسان کی ذات جو خدا کی شبیہ ہے جاتی رہی۔ بکنیل صاحب کا یہ خیال ہے کہ پیدائش کی کتاب میں انسان کی جومعصومی دکھائی جاتی ہے کوئی ایسی خوبی نہیں جو کسی خاص زمانہ میں انسان کو حاصل تھی بلکہ وہ خوبی جو انسان کو حاصل ہونا چاہیے تھی مگر اُس نے فوراً یا بہت جلد اُسے کھودیا۔

نیبورصاحب کی تعلیم بھی اس کے موافق ہے۔ بشپ ساؤتھ صاحب نے سترہویں صدی میں کسی وعظ میں آدم کی خوبیوں کی بابت بہت مبالغہ کیا اورکہا" ارسطاطالیس محض آدم کا بگاڑتھا"۔

پہلے انسان میں نیکی وبدی کی پہچان، محبت، قوتِ ارادہ تھیں۔ یہ سب گناہ کے ذریعہ سے بگڑ جاتی ہیں پر پورے طورپر جاتی نہیں رہتیں۔ انسان کی ماہیت موجود ہے یعنی

اُس میں الٰہی شبیہ بگڑ جاتی ہے پر پورے طورپر کافی نہیں ہوتی۔ ایک مسئلہ پرکسی زمانہ میں بہت زوردیا جاتا تھا جس کو انگریزی میں ٹوٹل ڈیپروٹی کہتے ہیں۔ یعنی انسان پورے طورپر بگڑا ہوا بتایا جاتا تھا۔اس صورت میں یہ مسئلہ کلام مقدس کی تعلیم کے موافق نہیں(مثلاً رومیوں ۲: ۱۲اور ۱۵)لیکن اس مسئلہ میں یہ سچائی ہے کہ انسان یہاں تک گناہ آلودہ ہے کہ ہمارے سب کاموں میں گناہ کی آلودگی موجود ہے اورہم صرف خدا کے فضل سے کوئی بھی ایسے خیال،قول یافعل کے لائق بن سکتے ہیں جوگناہ سے پورے طورپر الگ ہو۔

الغرض انسان ذاتی اورفطرتی طورپر گناہ اوربدی کی طرف مائل ہے۔یہاں تک کہ رومیوں کے ساتویں باب کے بیان کے موافق جب وہ نیکی کرنا چاہتا ہے تواچھی طرح نہیں کرسکتا بلکہ برائی میں پھنس جاتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی ملک یاقوم میں جب سیاست میں انقلاب ہوا ہے تونیتجہ کبھی خاطر خواہ نہیں ہوا۔عوام کے فائدے کا جو انتظام کیا جاتا ہے اُس سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ جب زیادہ تر آدمی صلح چاہتے ہیں تب برعکس اس کے جنگ ہوتی ہے۔ جو ملک مثلاً ہندوستان صلح جو ہوتے ہیں وہ بھی لڑائی کرنے پرمجبورہوتے ہیں یا اپنے آپ کو مجبورسمجھ کرجنگ کرتے ہیں۔ رومیوں کے ساتویں باب میں پولوس رسول کا تجربہ بیان کیا جاتا ہے وہ ہرفرد بشرکا تجربہ ہے۔ پڑھنے سے معلوم ہوگا۔

پس بنی نوع انسان کی بہتری اورترقی کیلئے نہ صرف تعلیم اچھے انتظام ، حکومت کے اچھے طریقہ ، کھانے ، پینے پہننے کے سامان کے افراط کی ضرورت ہے بلکہ اس بات کی کہ خدا ہمارے آقا ومولا سیدنا مسیح کے وسیلے سے آدمیوں کو تبدیل کرے۔ یہ کام خدا جبراً نہیں کرتا۔ لازم ہے کہ آدمی ایمان لائیں اورمسیح کو قبول کرکے روح القدس حاصل کریں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بچانہیں سکتا۔ نجات دہندہ کی ضرورت ہے۔

باب ششم
انسان کی عظمت

انسان عموماً اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ اوریہ مسلمانوں کا محاورہ ہے پر درحقیقت دینِ عیسوی سب دیگر ادیان کی بہ نسبت انسان کی زیادہ عظمت بتاتا ہے۔

پانچویں باب میں اس بات پر زوردیا گیا ہے کہ انسان بگڑا ہوا۔ گناہ کی طرف مائل اوراپنے آپ کو بچانے کے قابل نہیں مگر مسیحی دین اورمسیحی علماء اس لئے انسان کی موجودہ ذلت پر زوردیتے ہیں کہ اس کا درجہ بڑا مانتے ہیں اگرچہ فی الحال وہ اس درجہ سے گرا ہوا ہے۔ وہ ادنیٰ ہے پر اُسے مخلوقات میں اعلیٰ ہونا چاہیے۔ زبورمیں یوں آیا ہے:

" جب میں تیرے آسمان پر جو تیری دستکاری ہے۔۔۔ غورکرتا ہوں۔

توپھر انسان کیا ہے کہ تواُسے یادرکھے۔۔۔۔

کیونکہ تونے اُسے خدا سے کچھ ہی کمتربنایا ہے۔

اورجلال اورشوکت سے اُسے تاجدارکرتا ہے۔

تونے اُسے اپنی دستکاری پر تسلط بخشا ہے۔

تونے سب کچھ اس کے قدموں کے نیچے کردیا ہے۔

سب بھیڑبکریاں گائے بیل

بلکہ سب جنگلی جانور

ہوا کے پرندے اورسمندرکی مچھلیاں

اورجوکچھ سمندرکے راستوں میں چلتا پھرتا ہے"(زبور ۸، ۳سے ۹تک)۔

پھر" خدا نے کہا ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اورآسمان کے پرندوں اورچوپائیوں اور تمام زمین اورسب جانداروں پر جوزمین پر رینگتے ہیں اختیارکھیں"(پیدائش ۱: ۲۶)۔

اورپھرآسمان تو خداوند کا آسمان ہے۔

لیکن زمین اس نے بنی آدم کو دی ہے"(زبور۱۱۵، ۱۶)۔

یہ تو عہدنامہ عتیق کی چند آیات ہیں اور عہدنامہ جدید بھی یہی تعلیم دیتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر مثلاً

"ابتدا میں کلام تھا اورکلام خدا کے ساتھ تھا اورکلام خدا تھا۔۔ اورکلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے

معمور ہوکر ہمارے درمیان رہا" (یوحنا ۱: ۱۔ ۱۴) یہاں بتایا گیا ہے کہ خدا کا کلام جو خود خدا ہے انسان بنا اورانسانوں کے درمیان رہا اوروہی لکھنے والا اپنے پہلے خط میں یوں لکھتا ہے" جو کوئی روی اقرارکرے کہ یسوع مسیح مجسم ہوکرآیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے"(۱یوحنا ۴: ۲)۔

پھر پولوس یوں لکھتا ہے کہ " خدا نے ۔۔۔ اپنے بیٹے کو گناہ آلودجسم کی صورت میں اور گناہ کی قربانی کےلئے بھیجا"(رومیوں ۸: ۳)یہاں یہ نہیں لکھا گیا کہ خدا کا بیٹا گناہ آلودجسم میں آیا۔ یہ توناممکن تھا۔ پر یہ کہ وہ گناہ آلودجسم کی صورت میں بھیجا گیا۔

نیزیہ بتایا گیا ہے کہ انسان خدا کا فرزند بن سکتا ہے مثلاً جتنوں نے اُسے قبول کیا اُس نے (یعنی مسیح نے) ان کو خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا"(یوحنا ۱: ۱۲) پھر" روح۔۔۔ گواہی دیتا ہے کہ ہم خدا کے فرزند ہیں"(رومیوں ۸: ۱۶) پھر" تم سب اُس ایمان کے وسیلے سے جو مسیح یسوع میں ہے خدا کے فرزند ہو"۔

علاوہ اس کے انسان خدا کے روح القدس کی سکونت گاہ بتایا جاتا ہے مثلاً تمہارا بدن روح القدس کا مقدس ہے"(۱کرنتھیوں ۳: ۱۶)۔

مذکورہ بالا آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مسیحی دین انسان کی عظمت سکھاتا ہے۔ اوّل تو وہ تجسم پر زوردیتا ہے۔ اس کوثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات مشہور ہے کہ مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ پاک ثالوث کا اقنوم ثانی، خدا کا بیٹا ، یسوع ناصری مجسم ہوا۔ اوریہ بھی کہ یہ تجسم محض صورت اختیارکرنا نہ تھا بلکہ درحقیقت خدا کا بیٹا انسان بنا۔ مسئلہ تجسم پر زوردینا یااس کی پوری تشریح کرنا میرا مقصد نہیں۔ خادم اپنے رسالہ " خدا کی بابت مسیحی دین کی تعلیم" میں یہ لکھ چکا ہے۔ محض اس بات پر زوردینا ہے کہ مسئلہ تجسم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان میں اورخدا میں کچھ موافقت ہے۔ ورنہ تجسم ناممکن نہ ہوتا۔ ہندوؤں کے اوتار اس مسئلہ کے موافق نہیں کیونکہ اُن سے یہ مراد ہے کہ خدا نے فقط انسانی (یاحیوانی) صورت اختیارکی۔ یہاں مسئلہ تجسم سے یہ مراد ہے کہ خدا سچ مچ انسان بنا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان ایک عظیم ہستی ہے یا کم ازکم کامل انسان جوگناہ سے نہ بگڑا ہوعظیم ہستی ہے۔ دیگرادیان مذکورہ بالا معنی میں تجسم کے امکان کے منکرہیں۔

پھر ایماندارمسیحیوں کی نسبت یہ تعلیم ہے کہ وہ خدا کا مقدس یعنی اس کی ہیکل ہیں۔فراموش نہ کیا جائے کہ ساتھ ہی اس کے مسیحی دین کی تعلیم ہے کہ انسان مخلوق ہے اوراپنی ذات سے خدا کے ساتھ ایک نہیں اورنہ خدا سے صادر ہے۔ خدا کا مقدس بننے کا امکان انسان کی عظمت کی دلیل ہے۔

نیزیہ سکھایا گیا ہے کہ اگرچہ گنہگارانسان اپنی ذات سے خدا کا فرزند نہیں توبھی مسیح کے ذریعہ سے ایمان لانے والے خدا کے فرزند ہوجاتےہیں۔ جب کوئی مہاراجہ کسی کو لے پالک بیٹا بناتا ہے تویہ اُس لڑکے کی نہایت عزت کا باعث ہوتا ہے اورخدا کا فرزند بننا اس سے بڑھکر ہے۔

جب خدا نے انسان کو خلق کیا تواس کو" اپنی صورت اورشبیہ پر" پیدا کیا۔آئیریئنس نےگمان کیا کہ صورت اورشبیہ میں فرق ہے اورسکھایا کہ گناہ کرنے سے انسان نے شبیہ کوتو کھودیا پر صورت کو نہ کھویا۔واضح ہو کہ عبرانی عبارتوں میں اکثر دوالفاظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے زبوراورانبیاء کے صحیفوں کے پڑھنے سے ظاہر ہے۔ نیز یہ بعض اور زبانوں میں بھی ہوتا ہے ۔ مثلاً اردو میں(میں حیران وپریشان ہوا۔ وہ بہت گھبرایا اور سٹپٹایا وغیرہ)۔ معلوم ہوتا ہے کہ آئیریئنس نے اس بات کو نظر اندار کیا۔ پراُس کی تعلیم میں یہاں تک سچائی ہے کہ گنہگارآدمی اگرچہ گنہگارہیں بہرحال خدا کی بلاہٹ سننے کے قابل ہیں۔

اسی قابلیت کے سبب سے ممکن ہے کہ خدا انسان کو اپنا لے پالک فرزندبناسکے۔ شائد کہا جائے کہ خدا سب کچھ کرسکتا ہے۔یہ درست ہے پرخدا انسان کو تبدیل کرکے اگر چاہے توفرشتہ بناسکتا ہے۔ مگر انجیل جلیل کی یہ تعلیم یہ نہیں کہ خدا انسان کوبالکل تبدیل کرکے اپنافرزند بناتا ہے۔ یہ کہ وہ اس میں اپنی صورت تازہ کرتا ہے" تم نے پرانی انسانیت کواُس کے کاموں سمیت اتارڈالا اورنئی انسانیت کوپہن لیا

جو۔ اپنے خالق کی صورت پر نئی بنتی جاتی ہے" (کلیسیوں ۳: ۹، ۱۰)۔

جوناظرین انجیلِ مقدس سے واقف ہیں اُن کو یاد ہوگا کہ جب صدوقیوں نے سیدنا مسیح سے قیامت کی نسبت سوال کیا تو خداوند نے اُن کو یاددلایا کہ خروج کی کتاب میں مندرج ہے کہ خدا نے فرمایا" میں ابرہام کا خدا اوراسحاق کا خدا اوریعقوب کا خداہوں" اورنیز مسیح نے یہ فرمایا کہ وہ تو مردوں کا خدا نہیں بلکہ زندوں کا ہے" ان باتوں کا یہ مطلب ہے کہ خدا الگ الگ شخصوں پر توجہ کرتا ہے اورنہ صرف قوموں اورملتوں کا خدا ہے بلکہ شخصوں کا ۔ یعنی خدا کے نزدیک شخصیت بڑی چیز ہے۔ یہ شخصیت اس الہیٰ صورت میں شامل ہے۔ گویااس کا ایک حصہ ہے۔ جس پر انسان خلق ہوا۔ اس کے موافق بائبل کی کئی ایک مضمون لکھے گئے ہیں مثلاً مسیح نے خودفرمایا" خوش ہوکہ تمہارا نام آسمان پر لکھے ہیں" (لوقا ۱۰: ۲۰) نیز فلپیوں کے خط میں مرقوم ہے کہ پولوس کے ہمخدمتوں " کے نام کتابِ حیات میں درج ہیں" یسعیاہ کے صحیفہ میں درج ہے کہ خدا تعالیٰ نے بنی سے فرمایا" میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تجھے نام لیکر بلایا ہے" کلامِ مقدس میں باربار بتایا جاتا ہے کہ خدا نے کسی کو مقررکیا یا بلایا۔ پولوس لکھتا ہے " خدا نے مجھے میری ماں کے پیٹ ہی سے مخصوص کیا" یسعیاہ کے چھٹے باب میں یسعیاہ کی شخصی بلاہٹ کاذکر ہے۔

ظاہر ہے کہ خدا شخصوں اور شخصیت کا لحاظ کرتا ہے ۔ چنانچہ فرض ہے کہ بنی آدم بھی ہر انسان کی شخصیت کا پاس کریں۔ عمانوائیل کانٹ نے نصیحت کی کہ ہم کسی آدمی کو محض اپنی غرضوں کو پوراکرنے کا ذریعہ کبھی نہ سمجھیں بلکہ سب آدمیوں سے ہمارا برتاؤ اس بناء پر ہو کہ وہ شخص ہے یہ نہایت مسیحی نصیحت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مسیحی دین مانا جاتا ہے وہاں پر خاص وعام کی قدر کی جاتی ہے۔ اسپتال، مدرسے، یتیم خانے،کوڑھی خانے وغیرہ قائم کرنے میں مسیحی کلیسیا ہمیشہ رہنما اورپیشوا رہی ہے یہ عقیدہ کہ ہرآدمی کے حقوق مانے جائیں اورکسی کی طرفداری نہ کی جائے مسیحی خیال ہے اورمسیحی دین کے معتقد قریب قریب ہمیشہ غریبوں اوردبے ہوئے لوگوں

کے مددگار رہے ہیں کیونکہ وہ نہ صرف یہ مانتے ہیں کہ خدا خود ہر فرد بشر سے محبت رکھتا ہے بلکہ یہ کہ خدا نے مسیح میں ہوکر دنیا سے اپنا میل ملاپ کرلیا اوردنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ابدی زندگی پائے"(یوحنا ۳: ۱۶) مذکورہ بالا آیتوں سے اوردیگر مضامین سے جو اُن سے ملتے جلتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ خدا خاص شخصوں سے بلکہ ہر فرد بشر سے تعلق رکھتا ہے بیشک خدا قوموں سے اورخاص کر اپنی کلیسیا سے سروکار ہے پروہ نیک آدمی کو بھی سنبھالتا اُس کی دعائیں سنتا اوراس کی نجات کا انتظام کرتا ہے۔

آدمی خدا کے گھرانے میں شامل ہونے کےلئے بلائے گئے ہیں یعنی اس کی قربت اور شراکت حاصل کرنے کے واسطے۔ یہ اعلیٰ حیثیت صرف اس وجہ سے انسان کو حاصل ہوسکتی ہے کہ خدا نے مسیح میں ہوکر دنیا کا اپنے آپ سے میل ملاپ کرلیا ہے(۲کرنتھیوں ۵: ۱۹) ورنہ انسان گناہ کے سبب سے خدا سے رفاقت نہ رکھ سکتا۔ یہ پیدائش کی کتاب میں بڑی خوبصورتی سے سکھایا گیا۔ جہاں بیان کیا جاتا ہے کہ حکم عدولی کرنے بعد آدم اورحوا خدا سے باغ کے درختوں میں چھپ گئے۔ (پیدائش ۳: ۸) خدا نے نجات کا کام کیا جیسا کھوئے ہوئے سکے اورکھوئی ہوئی بھیڑ کی تمثیلوں سے ظاہر ہے پر انسان اس کے جواب میں توبہ کرکے خدا کی طرف رجوع لا سکتا ہے جیسا مصرف بیٹے کی تمثیل سکھاتی ہے (لوقا۱۵)۔

اُس کتاب میں جو پطرس کا دوسرا خط کہلاتا ہے ۔ یہ بتایا گیاہے کہ خدا نے "ہم کو اپنے خاص جلال اورنیکی کے ذریعہ سے بلایا جن کے باعث اُس نےہم سے قیمتی اورنہایت بڑے وعدے کئے تاکہ اُن کے وسیلے سے تم اُس خرابی سے چھوٹ کر جو دنیا میں بُری خواہش کے سبب سے ہے ذات الہیٰ میں شریک ہوجاؤ"(۲پطرس ۱: ۳۔ اور۴) یہ انسان خدا کی عظمت اوراس کی اعلیٰ بلاہٹ اورنیز نجات پانے کی حاجت نہایت عمدہ طورپراختصار کے ساتھ بتاتا ہے۔

مسیحی دین جمہوری سلطنت کی بہترین بنیاد ہے جو جمہوریت کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ بہ نسبت اس کے کہ تمام رعایا سلطنت میں حصہ دارہوں بہتر یہ ہے کہ بڑے

بڑے قابل اورپڑھے لکھے آدمی اوروہ آدمی جو اچھی نسل کے ہیں حکومت کا انتظام کریں اورجمہوریت کے دشمن اس بات پر ہنستے ہیں کہ ہر عام شخص ووٹ دینے کا مستحق سمجھا جائے۔ پر جو لوگ مانتے ہیں کہ مسیح ہر ایک لئے قربان ہوا اورہرایک ایماندارخدا سے رفاقت رکھ سکتا بلکہ ذاتِ الہیٰ کی شرکت پاسکتا ہے وہ جمہوری سلطنت کا قائل ہوگا(ممکن ہے کہ جمہوری سلطنت کا صدربادشاہ ہو جیسا انگلستان کا حال ہے)۔

نیز دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو اپنی قوم یا اپنی نسل یا فقط جلد کی رنگت پرپھول کر اوروں کو ہیچ جانتے ہیں۔ اگریہ سوال کیا جائے کہ اچھوت ذاتوں کے لوگ کیوں نیچ نہ سمجھے جائیں تو اس کا جواب دین عیسوی کی تعلیم میں ملتا ہے ۔ تمام آدمی برابر نہیں۔ ایسا خیال بالکل خادم ہےپر سب آدمیوں سے خدا محبت رکھتاہے ۔ چنانچہ ہر فردبشر کو شخص جان کر اس کی عزت کرنی چاہیے اوراس کی جان اوراس کی بہبودی کو گرانقدارسمجھنا لازم ہے۔

انسان اکثراپنے کام کی بابت رنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کی کون پروا کرتا ہے۔ اس کا ہونا اورنہ ہونا برابر معلوم ہوتا ہے۔ زبور میں یوں مرقوم ہے" ہمارے ہاتھوں کے کام کو قیام بخش"

ہاں ہمارے ہاتھوں کے کام کو قیام بخش"(مزمور۹۰: ۱۷)۔

یہ مزمور اکثرمرُدوں کے دفن کے وقت پڑھا جاتا ہے جب انسان میں فنا اوربے ثباتی کے خیال خوامخواہ دل میں آتے ہیں اوراس کی رسم ترتیب میں اس کا دعا کا جواب بھی ملتاہے " اے میرے عزیز بھائیو! ثابت قدم اور قائم رہو اورخدا کے کام میں ہمیشہ افزائش کرتےرہوکیونکہ یہ جانتے ہو کہ تمہاری محنت خداوند میں بے فائدہ نہیں ہے"(۱کرنتھیوں ۱۵: ۵۸)۔

باب ہفتم

انسان کے فرائض

خادم کو یہ امر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی بابت مسیحی دین کی تعلیم کی تشریح کرتے وقت کچھ نہ کچھ آدمیوں کے فرائض کی نسبت لکھنے پر خطرہ ہے کہ وہ محض اخلاقی زندگی کی کسی کتاب کا خلاصہ لکھے اورمفصلات کے جنگل میں گمراہ ہوجائے۔بہر حال کوشش کرنا پڑے گی اس لئے کہ اوّل انسان کے فرائض اہم ہیں اوردوم مسیحی دین ان کی بابت بہت کچھ سکھاتا ہے۔

۱۔مسیحی دین کی تعلیم یہ ہے کہ اچھے چال چلن کی بنیاد اچھا دل ہے۔ جب تک آدمی کی طبعی حقیقت (جس کو انگریزی میں کیرکٹر کہتے ہیں)اچھی نہیں بنتی اُس کے اخلاق اچھے نہیں ہوسکتے۔" اچھا درخت بُرا پھل نہیں لا سکتا نہ بُرا درخت اچھا پھل لا سکتا ہے"(متی ۷: ۱۷)اگرکوئی آدمی چاہے کہ اسکے گھر میں بجلی کی روشنی ہو تو وہ کبھی مستریوں سے نہ کہے گا" تم کیوں اتنے تاروں کو لا رہے ہو۔ میں تاروں کو نہیں چاہتا بلکہ روشنی" توبھی بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جب مسیحی واعظ دل کی تبدیلی پر زوردیتے ہیں توجھک مارتے ہیں اوروہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں نیک چلنی پر زور دینا چاہیے۔ مگربغیردل کی تبدیلی کے نیک چلنی کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔

۲۔اخلاق کی بنیاد کیا ہےیعنی نیکی کی کیا بنیاد ہے؟ راستبازی وہ ہے جو انسان کی حقیقت کے موافق ہے۔ انسان مخلوق ہے لہذا خالق کی طرف اس کے خاص فرائض ہیں۔ انسان صحبت اورتمدن کے لئے پیداہوا ۔ اسلئے بہت سے فرائض دوسرے آدمیوں کے متعلق ہیں۔ انسان پاک اورراست خدا کی قربت کیلئے پیدا ہوا۔ لہذا اس کے بعض فرائض انفرادی ہیں یعنی وہ کام ہیں جن کے کرنے سے وہ اس قربت کے لائق بن سکے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نیکی محض اس سبب سے نیکی ہے کہ خدا نے حکم دیاکہ ایسے ایسے کام کرنا چاہیے۔مگریہ غلط ہے۔ ہم خدا کوراست کہتے ہیں پراس کی راستی کا کوئی معیار ہونا چاہیے اورجو معیار ہمارے پاس ہے وہ انسان کی

راستبازی ہے۔ پر اگر یہ راستبازی محض خدا کی مرضی پر موقوف ہوتی تو خدا کوراست کہنا بے معنی ہوتا۔

اخلاقی فرائض دوطریقوں سے تقسیم ہوسکتے ہیں۔

الف۔ (۱۔) انفرادی فرائض، (۲۔) تمدنی فرائض(۳) روحانی فرائض۔

ج۔ خدا کے لحاظ سے ۔ اپنے آپ کے لحاظ سے ۔پڑوسی کےلحاظ سے اپنے ملك اوردیگر ممالك کےلحاظ سے۔

خدا کے لحاظ سے انسان کےکیا کیا فرائض ہیں یعنی خالق کے روبرو مخلوق پر اورنجات دہندہ کے روبرو گنہگار پر کیا کیا فرض ہیں؟ پہلا فرض یہ ہے کہ ہم خدا کو مانیں اوریہ نہ صرف اپنی عقل سے بلکہ اپنے ارادہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو یہ ماننا لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد یہ نہ بنائے کہ جو کام خود اُسے پسند آئیں اُن ہی کو انجام دیں بلکہ وہ کام کرے جن کا خدا نے حکم دیا۔ یہ ہماری قوتِ ارادہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ ہم اپنے ارادہ کو اوراپنی مرضی کو مدِ نظر نہ رکھیں بلکہ خدا کی مرضی کو۔ درحقیقت اس میں ہماری بہبودی ہے پر ہماری بہبودی مطلوب نہ ہو ورنہ فوت ہوگی۔خدا کی مرضی پوری کرنے سے ہماری بہبودی اُس وقت ہوتی ہے جب ہم اپنے آپ کو فراموش کرکے صرف خدا کی مرضی اوراُس کے جلال کے اظہار کے خواہاں اورکوشاں ہوتے ہیں ورنہ ہم خود پھر اپنی زندگی کے مرکز ہوجاتے ہیں۔

پھر چاہیے کہ ہم خدا کی عبادت کریں کیونکہ ایسا کرنے ہی سے ہم اپنی مخلوقی کو یادرکھ سکتے ہیں اورنیز خالق کا حق ہے کہ مخلوق اُس کا عابد ہو۔ عبادت کوئی اوپری کام نہیں جو دین کا ایك غیر ضروری حصہ ہے جس کی دینداروں میں خواہش پیدا ہوتی بلکہ عبادت دین کی حقیقت اورجوہر ہے۔

اپنے آپ کے لحاظ سے انسان کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے جسم، اپنے دماغ اوراپنی روح کو خدا کی عبادت کرنے اورخدا کی مرضی پوری کرنے کے قابل بنارکھے۔ کسی کو اجازت نہیں کہ ایسے ایسے کام کرے یا ایسے ایسے خیالات دل میں رکھے جن سے اس کا جسم بگڑ جائے یااُس کی عقل ٹھکانے نہ رہے یااُس کی روح بدی کے بس میں آجائے۔

ان فرائض کوہم بمشکل اُردو کےکسی ایک لفظ کے ماتحت لاسکتے ہیں مگریہ کہہ سکتے ہیں کہ آدمی کو چاہیے کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ شرابی، کبابی، غصہ ور، لُچا، زردوست وغیرہ وغیرہ اپنے پڑوسیوں کا نقصان توکرتےہیں مگراپنا زیادہ نقصان کرتے ہیں۔

ایسا کھانا کھانا جس کی بابت ہم کو معلوم ہے کہ اُس سے بدہضمی پیدا ہوگی محض اس سبب سے کہ لذیذ ہے بے صبری اورگناہ میں داخل ہے۔ اپنے غصہ کو اوراپنی زبان کو لگام دینا چاہیے۔جب ہم ایسے آدمی کو دیکھتے ہیں جوگالی سنکر گالی دینے سے پرہیزنہیں کرسکتا تویہ خیال آتا ہے کہ یہ کیسا بے صبرآدمی ہے۔بعض لوگ زیادہ نیند سے اپنے وقت کوضائع کرتے اوربعض کم نیند سے اپنی صحت کو بگاڑتے ہیں دونوں معیوب ہیں۔ بعض غفلت سے اپنی صحت کو بگاڑتے ہیں اوربعض آرام طلبی سے مشکلات سے دوررہتے ہیں دونوں گنہگارہیں۔

ایک بات کو فراموش نہ کریں یعنی یہ کہ انسان اپنے آپ کو بنا بھی سکتا ہے اوربگاڑی بھی سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی آدمی نے ایک مشہور واعظ سے پوچھا" شیطان کو کس نے بنایا؟" جواب یہ ملا" خدا نے شیطان کو پیدا کیا مگراُس نے اپنے آپ کو شیطانی بنایا" جب ہم کسی معصوم شیرخواربچے کو دیکھتے ہیں توخوش ہوتے ہیں لیکن یادرہے کہ پطرس بھی شیرخواربچہ پیدا ہوا اوریہوداہ اسکریوتی بھی۔ جتنے مقدس گذرے ہیں اورجتنے ظالم، شریر، دغا باز وغیرہ گذرے ہیں سب معصوم تھے۔ بےشک ہرایک آدمی کو ایک فطرتی طبیعت ملتی ہے اوربعضوں کو زیادہ اچھے موقع ملتے ہیں بعضوں کو کم۔ ہمارا موجودہ حال، اچھا یا بُرا دوقسم کی باتوں پر مبنی ہیں۔ اوّل، وہ جو ہم کو دی گئی ہیں۔ ہماری طبیعت، ہمارا ماحول، ہماری تربیت، دوم۔ ان کا استعمال جوہم پر موقوف ہے۔

پادری پیٹرگرین صاحب کہتے ہیں کہ ایک پرہیزگارآدمی نے اپنے بھائی کا جو شرابی تھا ذکرکیا اورکہا" ہرحال اُس پرالزام لگانا ٹھیک نہیں۔ اس کا باپ ہمیشہ پیتا تھا اوربھائی نے اُسی سے یہ عادت سیکھی" گرین صاحب نے کہا" مگرآپ اُسی باپ کے بیٹے ہیں پر شراب نہیں پیتے"۔ اُس آدمی نے کہا" ہاں۔ میں

نے اُس کی خرابی پہچانی"۔ دونوں ایک ہی گھر میں پلے۔ دونوں کی ایک ہی تربیت ہوئی مگر ایک پرہیزگار نکلا اوردوسرا شرابی، انسان اپنے آپ کو بنایا بگاڑ سکتا ہے بلکہ بنانے یا بگاڑنے پرمجبور ہے۔ بہت سے آدمی ایسے کام اس وقت کرتے ہیں خواہ اچھے خواہ بُرے جن کو وہ دس یا بیس برس پہلے نہیں کرسکتے تھے۔

یسعیاہ نبی کے صحیفے میں یوں مرقوم ہے" خداوند کی روح اُس پر ٹھہریگی۔ حکمت اورخرد کی روح ، مصلحت اورقدرت کی روح معرفت اورخداوند کے خوف کی روح" (باب۱۱: ۲) یہ صفتیں انسان کو چاہیے۔ وہ کیا ہیں۔ حکمت یہ ہے کہ ہم زندگی اوردنیا کی باتیں سمجھیں۔ خرویہ ہے کہ ہم اپنے علم پرعمل کرسکیں۔ مصلحت یہ ہے کہ جب دویاتین کام ممکن ہوں توہم اُن میں سے ٹھیک طورپر ایک کوچن سکیں۔ قدرت یعنی روحانی قدرت یہ ہےکہ ہم میں ایسی مضبوط طبیعت ہو کہ جو کام ہم بہتر دیکھتے ہیں اس کو تکمیل تک پہنچائیں۔ معرفت یہ ہےکہ ہم زندگی کے واقعات سے خدا کو پہچانیں اوروہ کام بھی پہچانیں جو خدا ہم سے چاہتا ہے۔ خداوند کا خوف یہ ہے کہ ہم تعظیم کے ساتھ خدا کے حکموں پر عمل کریں اوراس کی عبادت کریں۔

تمدنی اخلاق اورتمدنی فرائض وہ ہیں جودیگر آدمیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض آدمی تواوروں کے آرام اور فائدے سے بالکل لاپروا ہوتے ہیں۔ یہ ہرجگہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ریل کے سفر میں ایسے ایسے لوگ ڈبے میں زیادہ اسباب لاتے ہیں اوراس کو میلا کرتے ہیں۔ شہر میں وہ اپنی میلی اورپرانی چیزیں سڑک میں پھینک دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ مگر بعض آدمی ہمیشہ اوروں کی ضرورت اور فائدہ کومدِ نظر رکھتے ہیں۔ کریکٹ کے ایک مشہور کھیلنے والے لارڈ ہاک کی بابت وارنر صاحب لکھتے ہیں" وہ سب سے پہلے دوسروں کا خیال کرتے تھے اوراپنا خیال سب سے پیچھے" اور" وہ حددرجے کے نیک خوتھے اورہر وقت اوروں کا لحاظ کرتے تھے"۔

ہمارے تمدنی فرائض حسب ذیل ہیں۔ خاندان کے لحاظ سے ۔ کسی انجمن کے لحاظ سے جس کے ہم شریک

ہیں۔ شہریاگاؤں کے لحاظ سے اپنے وطن کے لحاظ سے ۔ کلیسیا کے لحاظ سے۔

سیدنا مسیح نے فرمایا" جوکچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی اُن کے ساتھ کرو"(متی ۷: ۱۲) یعنی جب کبھی ہم دیکھیں کہ کسی کوکسی چیزیا کسی مدد کی ضرورت ہے توحتی الامکان اس کودیں۔ یہ قاعدہ کسی نے اس پیرائے میں لکھا" ہرکام کی بابت یہ سوچوکہ اگرمیری حیثیت کے تمام آدمی ایسا ہی کریں جیساکہ میں کرتاہوں تودنیا کا کیا حال ہوگا؟ " ہمارے مولا نے کہا کہ دوبڑے بڑے حکموں میں سے ایک یہ ہے" اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھنا" ۔یہ عملی حکم ہے جس کا مطلب یہ ہےکہ جس طرح ہم اپنی بہبودی کے جویاں ہوتےہیں ویسا ہی اوروں کے بھی فائدے کے جویاں ہوں۔

ملک کے اعتبارسے لازم ہے کہ اس کے قانون مانیں۔ اسکی مال گزاری اورٹیکس کو ایمانداری سے ادا کریں اوراس کی بہتری کی کوشش کیا کریں۔ بے شک اگروطن کو کوئی قانون خدا کے حکموں کے خلاف ہو تو خدا کےحکموں کو ماننا چاہیے"(اعمال۵: ۲۹) مگر عام طورپر مسیحی کو قوانین کا پابند رہنا لازم ہے (رومیوں ۱۳: ۱سے ۷تک، ۱پطرس ۲: ۱۳، ۱۴ ۔ ططس ۳: ۱)۔

تین اورباتیں ذکر کے قابل ہیں۔ درحقیقت بہت سی ایسی باتیں ہیں مگریہ رسالہ محض اخلاقی تعلیم کا نہیں اورباب کوطول دینا ٹھیک نہیں۔

۱۔ خدا کے روبروانسان کا کوئی حق نہیں۔اس کی وجہ یہ ہےکہ ہمارے خلق ہونے کا مقصد یہ ہےکہ ہم خدا کا جلال ظاہر کریں اوراس کی قربت حاصل کریں نہ کہ وہ ہمارے لئے کچھ کرے۔ بہرکیف اس بات کی ضرورت بھی نہیں کہ خدا کے روبرو ہمارے کچھ حقوق ہوں کیونکہ وہ پرُمحبت ہے اورہمیشہ ہمارا بھلا چاہتا ہے۔ مگرمخلوق کے خالق کے سامنے حقوق نہیں۔ فقط فرائض ہیں۔

۲۔انسان کی زندگی محض اس جہان میں نہیں بلکہ دوسرے جہان میں بھی ہے۔ اگرہم بالکل فانی ہوتے اورجسم کے ساتھ روح بھی مرتی توہمارے فرائض اورہی ہوتے کیونکہ ہماری حقیقت اورہوتی اورہمارے فرائض ہماری

حقیقت کے موافق ہیں۔ لہذا ضرور ہے کہ اخلاق کوسوچتے وقت ہم محض اس جہان کا لحاظ نہ کریں ورنہ غلطیوں میں پھنس جائیں گے۔

۳۔ نیکی کرنے کی محض یہ غرض نہ ہو کہ اس سے ہم کو دنیا وی اورسماوی فائدہ ہوگا کیونکہ یہ خودغرضی ہے اورخودغرض آدمی نہ تو خدا کو پسند آسکتا ہے نہ انسان کو۔ خودغرضی سارے اخلاق میں مخل ہوتی ہے۔ پھرہم غلامانہ طورپر بھلائی نہ کریں کہ محض شریعت حصہ گنہگار کی ناپاکی اورآلودگی ہے۔ پھر لازم ہے کہ گنہگاراپنے گناہوں کی بدی کو پہچان کراس کا بوجھ اٹھائے اوراس سے تنفرکرکے اُس سے پوری توبہ کرے پریہ گنہگارکی طاقت سے باہر ہے لیکن سیدنا مسیح نے گناہ بلکہ تمام دنیا کے گناہوں کا پورا بوجھ سہا اوراُس سے کامل تنفر کیا اوروہ فرمانبرداری پوری کی جو انسان کوکرنا لازم ہے۔ مگروہ نہیں کرسکتا۔ جوکام ہم کوکرنا لازم ہے مسیح نے ہمارے بدلے کیا اورہم ایمان کے ذریعہ سے اس کے اس کام میں شریک ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہم میں سچی توبہ اورفرمانبرداری پیداہوتی ہیں۔

۱۱۔ اخیر میں خادم پھر یاددلانا چاہتا ہے کہ نجات کا کام خدا ہی نے پوراکیا۔ یہ سب اس کی محبت کا نتیجہ ہے کہ اُس نے مسیح میں ہوکریہ سب کچھ کیا اوردنیا کا اپنے آپ سے میل ملاپ کرلیا(۲کرنتھیوں ۵: ۱۹) مسیح کی موت اورمسیح کا دیا ہوا کفارہ خدا یعنی پاک ثالوث کا کام ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گنہگار انسان خدا کے لئے لے پالک فرزند ہوکر معافی پاتے اورنیک بنتے ہیں۔ " مسیح ابن آدم بنا کہ ہم خدا کے فرزند بنیں۔"

باب نہم
انسان کا انجام

۱۔ انسان کو مرنا پڑتا ہے۔اِس وقت میں زندہ ہوں اور زندوں کی زمین میں رہتاہوں۔ ایک دن آئے گا کہ میں مرجاؤں گا ۔ میرا جسم سڑجائے گا اورمیری روح دوسرے آدمیوں کی زندگی۔ اُن کے احساس اوراُن کے تجربہ سے الگ ہوگی۔چنانچہ یہ سوال کہ انسان کا کیا انجام کیا حشر ہے میرے اورتمام بنی آدم کےلئے سب سے اہم سوال ہے۔

پرانے زمانے میں یونانی اوراس زمانے میں بہت سے لوگ خصوصاً ہندویہ خیال کرتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ پہئے کی طرح ہے یعنی جوکچھ اس وقت ہوتا ہے وہ پہلے ہوچکا اوربارباریھرہوتا رہے گا اچھے زمانے (یایُگ) بھی ہوتے ہیں اوربُرے بھی اور ہرایک اپنی باری پر باربار وقوع میں آتا ہے۔ مسیحیوں کا عقیدہ جوپرانے اورنئے عہدنامہ کی تعلیم پر مبنی ہے یہ ہے کہ تواریخ محض واقعات کے سلسلہ کا بیان نہیں ورنہ وہ بے مطلب ہوتی۔ بلکہ یہ کہ واقعات کے سلسلہ کا ایک مقررہ انجام ہے اوریہ سلسلہ ختم ہوگا اوراس کا انجام یہ ہوگا کہ" سب میں خدا ہی سب کچھ ہوگا"(۱کرنتھیوں ۱۵: ۲۸)۔اس کی سزا سے بچنا نئے عہدنا میں نہ صرف گناہوں کی معافی بلکہ گناہ سے پاک ہونے کاذکر ہے۔ مثلاً" اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو وہ(یعنی خدا) ہمارے گناہوں کےمعاف کرنے اورہمیں ساری ناراستی سے پاک کرنے میں سچا اورعادل ہے"(۱یوحنا ۱: ۹)۔

گناہ کا یہ نتیجہ ہے کہ گنہگارخدا سے جدا ہوجاتا ہے لہذا اس کو خدا سے میل ملاپ پانا ضروری ہے۔ یہ معافی میں شامل ہے کیونکہ ازروئے بائبل معافی یہ نہیں کہ خدا محض انسان کے گناہوں کو نظراندازکرے بلکہ گنہگارکا اپنے آپ سے میل ملاپ کرلے تاکہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرسکے جو بے گناہوں کا حق ہے اوراُس کے گناہوں کو دورکرکے اس کو اُن سے رہائی بخشے۔

۲۔ انسان کی نجات کیلئے انسان کا ایمان درکارہے۔ بیمار غشی کی حالت میں بعض وقت ڈاکٹر کےسوئی لگانے سے اچھا ہوجاتا ہے۔ جوآدمی خودکشی کرنا چاہتاہے وہ شائد

زبردستی موت سے بچایا جائے مگر گنہگار اپنی مرضی کے برعکس گناہ سے نہیں بچ سکتا کیونکہ گناہ نہ صرف بُرے افعال کا نام ہے بلکہ خاص کر اُس برُی مرضی کا جس کے سبب سے آدمی گناہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اگرچہ اپنی نجات کےلئے ہم کچھ بھی نہ کرسکیں پر کم ازکم خدا کی دی ہوئی نجات قبول کرنا پڑتی ہے کیونکہ جب تک آدمی گناہ سے بچنا نہیں چاہتا اُس وقت تک وہ بچ ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ خدا نے انسان کو نجات کا جو انتظام کیا ہےاس کا اثر انسان کی مرضی پر پڑنا چاہیے۔

۳۔ انسان کیونکر حقیقی توبہ کرے یعنی آدمی کس طرح سے اپنے دل اور اپنی مرضی کو گناہ سے ایسا پھیردے کہ ہمیشہ گناہ سے متنفر رکھے اورکیونکر اپنے پُرانے بُرے کاموں کے سبب سے افسوس کرے یعنی ایسا افسوس جس میں ذرا بھی آمیزش نہ ہو؟

یہ ظاہر ہے کہ آدمیوں میں یہ تبدیلی جبراً نہیں ہوسکتی۔ بفرضِ محال اگرآدمی کے خیالات اسکا مزاج، اوراُس کے ارادے زبردستی سے بدل ڈالے جائیں تووہ درحقیقت انسان نہ رہیگا کیونکہ انسان ایسی ہستی ہے جو اپنی رضا مندی سے ارادہ کرے۔ دراصل اگریہ فرض کرلیاجائے کہ کسی خارجی اوربیرونی طاقت سے بغیراس کی رضا مندی کے کسی شخص کے ارادے بدل دئیے جائیں تو وہ ارادے ہی نہ رہیں گے۔

۴۔ پھرگنہگار کوتوبہ کرکے اپنا گناہ چھوڑنا لازمی امر ہے۔یہ کس طرح سے ہوسکتا ہے؟ گناہ آدمیوں کے خیالوں کو ایسا بگاڑدیتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے تنفر نہیں کرسکتے اورنیزآدمیوں کی اصلاح اورسدھا روک دیتا ہے ۔گنہگار کی اصلاح پوری اورجڑ سے ہوناچاہیے ۔ یہ نہیں کہ ایک دگناہوں کوچھوڑدے بلکہ اُس کے خیالات اُس کی خواہشیں، اُس کے ارادے سب کے سب راست ہوجائیں۔

۵۔ علاوہ اس کے چاہیے کہ خدا کا انصاف ظاہر ہو ورنہ گناہوں کی معافی کا نتیجہ یہ ہوگاکہ لوگ معافی کا یقین کرکے گناہ کرنے میں بے باک ہوجائیں گے اورخداتعالیٰ کی توہین ہوگی۔ یہ خداکا حق ہے۔ وہ گنہگار سے محبت رکھتا ہے یہاں تک کہ اُس نے نجات کا انتظام کیا اور فضل کے وسائل

تیارکئے مگرجیسا گنہگارخدا سے دور ہے ویسا ہی خدا گنہگار سے دور ہے۔ فرق یہ ہے کہ اکثر گنہگارخدا کے نزدیک نہیں آنا چاہتے پرخدا یہ چاہتا ہے کہ گنہگار کے نزدیک جائے۔ جبھی تو سیدنا مسیح میں اقنوم ثانی مجسم ہوا۔

۶۔ اب مسیح کی صلیبی موت انسان کے سخت دل کو ملائم کردیتی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے ہم سے ایسی محبت رکھی کہ صلیب کی اذیت اوربے عزتی گوارا کی ۔ نیز جب خدا کے بیٹے نے جوباپ کے ساتھ ایک ہے انسان کی نجات کاذمہ کیا تو اسے جو بے گناہ تھا گنہگارکی طرح دکھ بلکہ مجرم کی موت برداشت کرنا پڑی۔اس کا اثر انسان پر یہ ہے کہ اس کا دل پگھل جاتااوراس کی مرضی جوخدا کے خلاف ہے ٹوٹتی ہے اوروہ کبھی گناہ کو جس کے سبب سے سیدنا مسیح کومرنا پڑاہلکی چیزنہیں سمجھ سکتا۔

۷۔ یہ بھی غورطلب بات ہےکہ سیدنا مسیح کے قاتل جنہوں نے اُسے مصلوب کرایا ایسے ایسے شخص نہ تھے جن کو عموماً بُرے سمجھتے ہیں۔ ڈاکوؤں ، بازاری پاجیوں، چوروں، بدمعاشوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا پرستوں، شریعت کے ماننے والوں ،مذہبی پیشواؤں نے یہ سب سے بڑا گناہ کیا اورکیوں کیا؟ اُن ہی گناہوں کے سبب سے جواکثر دنیا کے اچھے لوگوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً حسد، ہٹ دھرمی، بزدلی ، خودغرضی ، غرور،اپنی نوکری اوراپنی آمدنی کی بابت فکرمندی ،کسی نہ کسی قدریہ باتیں سب کےدلوں میں ہیں۔

۷۔ پریہ خیال نہ کیا جائے کہ خادم کا مطلب یہ ہے کہ صلیب کا صرف یہ نتیجہ ہے کہ گنہگارمان لیں کہ خدا ہم سے محبت رکھتا ہے ورنہ یہ نتیجہ نکلتا کہ گناہ کی بابت فکر مند ہونا کبھی ضروری نہ تھا۔ مقدس انسلیم کا قول اب تک ہم میں سے اکثروں کے حق میں سچا ہے" تونے اب تک گناہ کی اہمیت نہیں پہچانی"۔

۸۔ مسیح کی زندگی۔ موت اور قیامت سے الہٰی زندگی انسان کیلئے مہیا ہوجاتی ہے۔ سیدنا مسیح نے اپنے آپ کو راہ اورحق اورزندگی بتایا۔ وہ آیاکہ ہم کو کثرت سے زندگی بخشے(یوحنا ۱۴: ۶۔ ۱۰: ۱۰) الہٰی زندگی کو ایک قسم کا لطیف مادہ نہ سمجھنا چاہیے ۔ یہ خطرہ ہمیشہ رہتا ہے کہ روح یا روحانی چیزیں سوچتے وقت ہم دل میں ایک قسم کے ہلکے

دھوئیں یا ہوا کا تصورکریں۔ الہٰی زندگی بالکل روحانی ہے اورخدا انسان کو مسیح کے وسیلے سے یہ زندگی بخشنا چاہتا ہے پر وہ " گھول کر نہیں پلاسکتا" بے ہوش مریض کو زبردستی ایسی دوامنہ سے یا سوئی سے دی جاسکتی ہے جوبہرحال اپنا اثر کرے پرروحانی زندگی کا یہ حال نہیں ۔ خدا جو انسان کی قوتِ ارادہ کو مٹاتا نہیں اُس وقت انسان کو اپنی زندگی بخش سکتا ہے جب انسان اُسے قبول کرنے پر راضی ہو۔یہ رضامندی مسیح کی موت پیدا کرتی ہے اورجب آدمی ایمان لاتا ہے توپاک روح اس کے دل میں سکونت کرکے اس کی خراب زندگی بدل کرالہی زندگی بنادیتا ہے یہاں تک کہ سیدنا مسیح کی صفات اُس میں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ خدا گنہگار کومعاف کرتا ہے مگراس کی زندگی کوبدل کر راست کردیتا ہے لیکن شروع ہی سے جب وہ ہنوزراستبازنہیں بنا اس کو راستباز ٹھہراتا ہے ۔

۹۔ سیدنا مسیح کی موت قربانی کہلاتی ہے" مسیح نے۔۔۔ ہمارے واسطے اپنے آپ کو خوشبو کی مانند خدا کی نذرکرکے قربان کیا"(افسیوں ۵: ۲) " مسیح ایک بارظاہر ہوتاکہ اپنے آپ کو قربان کرنے سے گناہ کو مٹادے"(عبرانیوں ۹: ۲۶)۔ اکثر لفظ قربانی تواستعمال نہیں ہوتا پر لفظ خون آتا ہے جس سے قربانی کا خون مراد ہے ۔ مثلاً "تمہاری خلاصی۔۔۔ ایک بے عیب اوربے داغ بُرے یعنی مسیح کے بیش قیمت خون سے "ہوئی (۱پطرس ۱: ۱۸، اور۱۹) " یسوع کا خون ہمیں تمام گناہ سے پاک کرتا ہے (۱یوحنا ۱: ۷)۔ مسیح یسوع کو" خدا نے اس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہو"(رومیوں ۳: ۲۵)نیز ہمارے خداوند نے خود پاک عشا کو مقررکرتے وقت فرمایا" یہ میرا عہد کا وہ خون ہے جو بہتیروں کےلئے بہایا جاتا ہے"(مرقس ۱۴: ۲۲)۔

قربانی درحقیقت کیا چیز ہے؟ اول یہ خدا کا دیا ہوا وسیلہ ہے(دیکھو احبار ۱۷: ۱۱) پُرانے عہدنامہ میں بتایا جاتا ہے کہ خدا نے جانوروں کا خون بخشا تاکہ کفارہ ہو اور خداوند مسیح نے اپنا خون دیدیا۔ پھر قربانی خدا کے نزدیک (قریب) آنے کا ذریعہ ہے۔ اُس میں انسان کی زندگی کےعوض جو اس کے گناہوں کے سبب سے ضبط ہونا

چاہیے دوسری جان قبول کی جاتی ہے۔ مسیح کی قربانی فرمانبرداری کی قربانی ہے (مرقس ۱۴: ۳۶، عبرانیوں ۱۰: ۷) سیدنا مسیح نے اپنی قربانی کے وقت پوری فرمانبرداری کی اوراپنی انسانی خواہش اورمرضی قربان کی۔ یہ قربانی کس طرح ہمارے لئے کارآمد ہوسکتی ہے؟ قربانی ایک قسم کی عبادت ہے۔ عبادت کیلئے ضرورہے کہ عابد شریک ہوں اوریہ قربانی اُس وقت ہمارے لئے مفید ہوتی ہے جب ہم عبادت خاص کر پاک عشا کی عبادت کرتے ہیں جب ہم اپنی راستبازی پر نہیں بلکہ مسیح کی قربانی پر بھروسہ کرکے عبادت کرتے ہیں اورجب ہم اپنی روزمرہ کی زندگی کی خدمت سے بھی عبادت کرتے ہیں۔

۱۰۔ مسیح کی قربانی کہاں تک ہمارے بدلے میں ہوئی۔ اوّل تو اُس نے دکھ اورصلیبی موت کو اس غرض سے قبول کیا کہ ہم دوسری موت سے (مکاشفہ ۲۱: ۸) بچیں۔ یہ نہ کہنا چاہیے کہ مسیح نے وہ سزا اٹھائی جوگنہگار کوسہنا چاہیے کیونکہ گناہ کی سزا کا سب سے ہولناک حصہ گنہگار کی ناپاکی اورآلودگی ہے۔ پھر لازم ہے کہ گنہگار اپنے گناہوں کی بدی کی پہچان کر اس کا بوجھ اٹھائے اوراُس سے متنفر کرکے اُس سے پوری توبہ کرے پر یہ گنہگار کی طاقت سے باہر ہے لیکن سیدنا مسیح نے گناہ بلکہ تمام دنیا کے گناہوں کا پورا بوجھ سہا اوراُس سے کامل تنفرکیا اوروہ فرمانبرداری پوری کی جو انسان کوکرنا لازم ہے مگر وہ نہیں کرسکتا۔ جوکام ہم کوکرنا لازم ہے مسیح نے ہمارے بدلے کیا اورہم ایمان کے ذریعہ سے اس کے اس کام میں شریک ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہم میں سچی توبہ اورفرمانبرداری پیدا ہوتی ہیں۔

۱۱۔ اخیر میں خادم پھر یاددلانا چاہتا ہے کہ نجات کا کام خدا ہی نے پورا کیا۔ یہ سب اس کی محبت کا نتیجہ ہے کہ اُس نے مسیح میں ہوکریہ سب کچھ کیا اوردنیا کا اپنے آپ سے میل ملاپ کرلیا (۲کرنتھیوں۵: ۱۹) مسیح کی موت اورمسیح کا دیا ہوا کفارہ خدا یعنی پاک ثالوث کا کام ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ گنہگار انسان خدا کے لے پالک فرزند ہوکر معافی پاتے اورنیک بنتے ہیں" مسیح ابن آدم بنا کہ ہم خدا کے فرزند بنیں"۔

باب نہم

انسان کا انجام

۱۔ انسان کو مرنا پڑتا ہے۔ اس وقت میں زندہ ہوں اور زندوں کی زمین میں رہتا ہوں۔ایک دن آئیگا کہ میں مرجاؤں گا۔ میرا جسم سڑجائیگا اورمیری روح دوسرے آدمیوں کی زندگی ۔ اُ ن کے احساس اوراُن کے تجربہ سے الگ ہوگی۔ چنانچہ یہ سوال کہ انسان کا کیا انجام کیا حشر ہے میرے اور تمام بنی آدم کےلئے سب سے اہم سوال ہے۔

پرانے زمانے میں یونانی اوراس زمانے میں بہت سے لوگ خصوصاً ہندویہ خیال کرتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ پہئے کی طرح ہے یعنی جوکچھ اس وقت ہوتا ہے وہ پہلے ہوچکا اورباربار پھرہوتا رہے گا اچھے زمانے (یایُگ) بھی ہوتے ہیں اوربُرے بھی اورہر ایک اپنی باری پرباربار وقوع میں آتا ہے۔ مسیحیوں کا عقیدہ جوپُرانے اور نئے عہدناموں کی تعلیم پرمبنی ہے یہ ہے کہ تواریخ محض واقعات کے سلسلہ کا بیان نہیں ورنہ وہ بے مطلب ہوتی۔ بلکہ یہ کہ واقعات کے سلسلہ کا ایک مقررہ انجام ہے اوریہ سلسلہ ختم ہوگا اوراس کا انجام یہ ہوگا کہ" سب میں خدا ہی سب کچھ ہوگا"(۱کرنتھیوں ۱۵: ۲۸)۔

جب سیدنا مسیح نے اس دنیا پر اپنا کام پورا کیا توایک زمانہ کا خاتمہ ہوا اورایک نیا زمانہ شروع ہوا۔ مگریہ زمانہ بھی ختم ہوجائے گا جس وقت خدا کے بیٹے کے تمام مخالف اس کے تابع ہوں گے(۱کرنتھیوں ۱۵: ۲۴سے ۲۸تک)۔

اس تعلیم سے یہ سوال لازم آتا ہے کہ جب زمانہ نہ رہے گا توپھر کیا ہوگا؟اس کا جواب ہے کہ ابدیت ہوگی۔ زمانہ اورابدیت کا تعلق اور فرق ایسی باتیں ہیں جوہم انسان کی جوگویا زمانے کے کیڑے ہیں کبھی پورے طورپر سمجھ میں نہیں آسکتیں پر اتنا ضرور درست معلوم ہوتا ہے کہ اوّل ابدیت زمانہ اورتواریخ کی بنیاد ہے دوم اس سیارے پر جسے ہم زمین کہتے ہیں تواریخ کا سلسلہ اس سبب سے ختم ہوگا کہ وہ وقت آئے گا جب زمین زندہ مخلوقات کے لائق نہ رہے گی(اسلئے یہ گمان کہ زمانے کے بعد زمانہ کرن کے بعد کرن۔

یگ کے بعدیگ ہمیشہ یہاں ہوا کریں گے سائنس کے معلومات اورتعلیم کے خلاف ہے)

سیم۔ اگرچہ زمانے کی حقیقت ابدیت پر منحصر ہے بہرحال وہ حقیقت محض دھوکا نہیں۔ اس لئے جب تک مادی یاروحانی عالم میں واقعات ہواکریں گے زمانہ کی مانند کوئی ایسا ظرف ہوگا جس کے دائرہ میں وہ وقوع میں آئیں گے۔

زمانہ کا خاتمہ عہدنامہ عتیق میں خداوند کا دن یا وہ دن کہلاتا ہے اوریہ محاورہ عہدنامہ جدید میں مستعمل ہے(مثلاً متی ۷: ۲۲۔ مرقس ۱۳: ۳۲۔ لوقا ۱۰: ۱۲۔ یوحنا ۱۴: ۲۰۔ ۱تھسلنیکیوں۵: ۴۔ نیز۱کرنتھیوں ۵: ۵۔ ۲کرنتھیوں ۱: ۱۴۔ ۲پطرس ۳: ۱۰)۔پھر وہ عدالت کا دن کہلاتا ہے (مثلاً مرقس ۶: ۱۱۔ متی ۱۲: ۳۶۔ ۱یوحنا ۴: ۱۷)طرح طرح کی تشبہیات اس کےلئے استعمال ہوئی ہیں اوریہ زیادہ ترخوفناک ہیں۔(دیکھو اعمال ۲: ۱۹اور۲۰)بائبل کی صاف تعلیم یہ ہے کہ آخر کارخدا خود دنیا کی تواریخ کو ختم کرڈالے گا۔ سائنس سے ہم اتنا معلوم کرتے ہیں کہ انسانی تواریخ ختم ہوگی پرپاک کلام یہ بھی سکھاتا ہے کہ اُس وقت سیدنا مسیح بنی آدم کی عدالت کرے گا اورخدا کی بادشاہی پورے طورپر قائم ہوگی۔

۲۔ موت ہر انسان کی دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہے اوریہ سوال کیا جاتا ہے کہ آیا موت درحقیقت محض گناہ کا نتیجہ ہے یا ہر صورت میں انسانی زندگی کا خاتمہ ہوتا۔ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں۔ ازروئے سائنس بے شک آدمیوں کی موت قدرتی واقعہ ہے اورچونکہ انسان کا جسم حیوانی ہے اسلئے اسکا مرنا ہرصورت میں امر ضروری ہے بہرحال کلام مقدس کی تعلیم پہلی نظر میں یہ معلوم ہوت ہے کہ موت محض گناہ کا نتیجہ ہے۔ پر غورکرنے پر اس کی حقیقت اور معلوم ہوتی ہے۔

پیدائش کی کتاب میں مرقوم ہے کہ" نیک وبد کی پہچان کے درخت کا پھل کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روزتونے اُس میں کھایا تومرا۔ بعد کو بتایا جاتا ہے کہ جب آدم وحوا نے اُس درخت کا پھل کھایا توخدا سے خوف کھانے لگے اورفردوس سے خارج کئے گئے پر جسمانی طورپر اُس روز نہ مرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ پیدائش کے اس مضمون کےلکھنے والے کے

خیال میں موت سے فقط جسم اور روح کا جدا ہونا مرادنہ تھا۔ اس مسئلہ پر کہ موت گناہ کی سزا ہے سواپولوس رسول کے قریب قریب اورکسی ملہم نے کچھ بھی نہیں لکھا مگرپولوس نے اس کا ذکرکیا ہے۔ مثلاً جب آدمی کے سبب سے موت آئی توآدمی ہی کے سبب سے مُردوں کی قیامت بھی آئی۔اورجیسے آدم میں سب مرتے ہیں ویسے ہی مسیح میں سب زندہ کئے جاتے ہیں "(۱کرنتھیوں ۱۵: ۲۱، ۲۲) پھر رومیوں کے نام کے خط کے پانچویں باب میں یوں مرقوم ہے" گناہ کے سبب سے موت آئی"اورپھر"آدم سے لیکر موسیٰ تک موت نے اُن پر بادشاہی کی جنہوں نے آدم کی نافرمانی کی طرح گناہ نہ کیا تھا۔۔۔۔ جب ایک شخص کے گناہ سے بہت آدمی مرگئے توخدا کی بخشش ایک ہی آدمی یعنی سیدنا مسیح کے فضل سے پیداہوئی بہت سے آدمیوں پر ضرورہی افراط سے نازل ہوگی"(آیات ۱۲: ۱۴تا ۱۵)۔نیزیہ بھی آیا ہے " گناہ کی مزدوری موت ہے"(رومیوں ۶: ۲۳) ہمیں یادرکھنا چاہیے کہ اُس زمانہ میں اوراُس سے پیشتربعض یہودی معلم پیدائش کے اس بیان کو جس میں باغِ عدن اورحیات کے درخت کا ذکر ہے تمثیل سمجھتے تھے جیسا آج کل بہت سے مسیحی علماء کا خیال ہے اس لئے ضروری بات نہیں کہ پولوس نے اس بیان کو تواریخ سمجھا۔یہ گمان کہ پولوس جو اپنے زمانہ کے بڑے عقیل اورعلیم شخصوں میں سے ایک تھا۔ علمِ الٰہی میں محض لکیر کا فقیر تھا بے شک بڑی غلطی ہے۔ ایک مقام میں پولوس نے لکھا کہ" موت کا ڈنک گناہ ہے" خادم کاعقیدہ ہے کہ پاک کلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ موت کو خراب اورخوفناک بتاتا ہے گناہ کا نتیجہ ہے اورنہ فقط جسم سے روح کی جدائی۔

لوئس صاحب اپنے ایک ناول میں جس میں قصہ کے پیرائے میں مذہبی تعلیم ملتی ہے ایک شخص کا بیان کرتے ہیں جو مریخ سیارے میں پہنچ جاتا ہے اوروہاں ایک قسم کا حیوان ناطق پاتا ہے جو انسان سے جداگانہ صورت رکھتا ہے پربے گناہ اورخدا پرست ہے۔ اس جنس کے مخلوق کے بارہ میں آپ بیان کرتے ہیں کہ ان میں موت کا بالکل خوف نہ تھا اُن کو معلوم تھاکہ کب مرینگے اوربغیر خوف کے موت کےلئے تیاررہتے تھے۔ اس کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان

گنہگار نہ ہوتا توموت محض دوسرے جہان کا دروازہ ہوتی اوراُس سے لوگ نہ ڈرتے۔ مسیح پر ایمان لانے والوں میں سے بعض اس درجہ تک ترقی کرتے ہیں کہ موت سے بہت کم ڈرتے ہیں۔ موت کا ڈنک گناہ ہے اورجیسا آدمی گناہ سے بچتا جاتا ویسا ہی موت کے خوف سے بچتا جاتا ہے۔

۳۔ تواریخ کا خاتمہ اُس کے شروع سے ظاہر نہیں اور تواریخ کا مطلب صرف اُس وقت معلوم ہوجائے گا جب اُس کا خاتمہ ہوگا کیونکہ واقعات کے اس سلسلہ کا خاتمہ جس کو ہم تواریخ کہتے ہیں اُس کی تکمیل ہوگا۔ بہرکیف انفرادی زندگیوں کے انجام کی بابت کلامِ حق میں کسی قدرخبردی گئی ہے۔ تمام عہدنامہ جدید میں بتایا جاتا ہے کہ آخرکار ہرفرد بشر کا انصاف کیا جائے گا مثلاً انجیل میں ذیل کی عبارتیں دیکھنا چاہیے۔متی ۱۳: ۲۴ سے ۳۰ تک۔ ۳۶ سے ۴۳تک۔ ۴۷ سے ۵۰تک ۔ ۲۵پورا باب۔ لوقا ۱۲: ۴۱سے ۴۸تک ۔ ۱۷: ۲۲ سے ۳۷تک۔ ۱۹: ۱۱سے ۲۷تک ۔یوحنا ۵: ۲۲سے ۲۹تک ۔ پھر خطوط میں آخری عدالت کا ذکر باربار آتا ہے۔ مکاشفہ اُس سے پُر ہے۔ پھر پولوس فرماتا ہے" ہم سب خدا کے تختِ عدالت کے آگے کھڑے ہوں گے" (رومیوں ۱۴: ۱۰) پھر " ضرور ہے کہ مسیح کے تختِ عدالت کے سامنے جاکر ہم سب کا حال ظاہر کیاجائے تاکہ ہرشخص اپنے ان کاموں کا بدلہ پائے جواُس نے بدن کے وسیلہ سے کئے ہوں خواہ بھلے ہوں خواہ بُرے (۲کرنتھیوں ۵: ۱۰)۔

عبرانیوں کے خط میں یوں مرقوم ہے " آدمیوں کے لئے ایک بار مرنا اوراُس کے بعد عدالت کا ہونا مقرر ہے"(۹: ۲۷) علاوہ اس کے اگرہمارے خداوند کی تمثیلوں پر غور کیاجائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے چالیس فیصد سے زیادہ عدالت کے بارہ میں ہیں۔

یہ صاف بتایا جاتا ہے کہ نیکوں کو اجر اوربُروں کو سزا ملیگی نیکوں کا اجر بعض اوقات ابدی زندگی کہا جاتا ہے بعض اوقات مسیح کے ساتھ ہونا (فلپیوں ۱: ۲۳) یا اپنے خداوند کی خوشی میں داخل ہونا (متی ۲۵: ۲۱اور۲۳) یا مسیح کے ساتھ بادشاہی کرنا(۲تیمتھیس ۲: ۱۲)یااس کی اعلیٰ خدمت کرنا(لوقا۱۹: ۱۷اور ۱۹)۔ابدی زندگی کی سب سے ضروری خاصیت یہ نہیں کہ اس کا کوئی خاتمہ نہیں کیونکہ محض زندہ

رہنا کوئی بہت بڑی بات نہیں جب تکہ یہ دائمی زندگی اچھی زندگی نہیں۔ اگرزندگی خراب ہوتواس کا بے خاتمہ ہونا محض خرابی بڑھانا ہے۔آرچ بشپ ٹیمپل صاحب مرحوم فرماتےہیں کہ بقا جب تک ہم خدا کی راستی اورمحبت کا لحاظ نہیں کرتے مذہبی مسئلہ نہیں۔ یوحنا کے سترہویں باب میں مرقوم ہے" ابدی زندگی یہ ہےکہ وہ تجھ خدائے واحد اوربرحق کو اوریسوع مسیح کو جسے تونے بھیجا ہے جانیں"(آیت ۳)یہاں میں نے ترجمہ بدل دیا کیونکہ میری دانست میں ہمیشہ کی زندگی یا اننت جیون نامکمل بلکہ ناقص ترجمے ہیں اس لئے کہ ان میں زندگی کےبے خاتمہ ہونے پرزور دیا جاتاہے ۔ابدی زندگی (یوحنانی،آلونیاس زوئی) وہ زندگی ہےجس کاتعلق ابدیت سے یعنی آنے والے جہان سے ہے اورخدا کی روحانی زندگی اوربادشاہی کے متعلق۔ ایسی زندگی بے خاتمہ ہے کیونکہ خدا کی حیات اوربادشاہی کا کوئی خاتمہ نہیں مگر زورمحض اس کے لا خاتمہ ہونے پر نہ دینا چاہیے۔

۴۔ عہدنامہ عتیق میں یہ تعلیم کہ دنیاوی زندگی کے بعدایک اورزندگی ہے بہت کم ملتی ہے۔ بعض زبوروں میں یہ صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ موت کے بعدانسانی زندگی نہایت دردناک اور بے مزہ ہے مثلاً" موت کے بعد تیری یاد نہیں ہوتی" قبرمیں تیری شکرگذاری کون کرے گا:(زبور۶: ۵) " جب میں گورمیں جاؤں تومیری موت سے کیا فائدہ۔ کیا خاک تیری ستائش کریگی"؟ (زبور۳۰: ۹) "مردے خداوند کی ستائش نہیں کرتے۔ نہ وہ جو خاموشی کے عالم میں اترجاتے ہیں ؟عبرانی پاتال یعنی عالم ارواح کومانتے تھے اوراس کو شی اول کہتے تھے اس کی بابت لکھاہے کہ " میں وہاں جاؤں جہاں سے پھر نہ لوٹوں گا۔یعنی تاریکی اورموت کی سرزمین کو گھری۔ تاریکی کی سرزمین جوخود تاریکی ہی ہے۔ موت کے سایہ کی سرزمین جوبے ترتیب ہے اورجہاں روشنی بھی ایسی ہے جیسی تاریکی "(ایوب ۱۰: ۲۱اور۲۲)پھر یسعیاہ کے صحیفہ میں جہاں بابل کے بادشاہ کی ہلاکت کاذکرہے۔ پاتال کےباشندوں کا بیان اسی کے موافق ہے(یسعیاہ ۱۴: ۹،۱۰)۔

اس لئے مسیح کے زمانہ میں صدوقی لوگ قیامت کو نہیں مانتے تھے۔کیونکہ شریعت میں اُس کا ذکر نہیں۔ بے شک دانی ایل کی کتاب میں لکھا ہے" جوخاک میں سورہے ہیں اُن میں بتہیرے جاگ اٹھینگے۔بعض حیات ابدی کےلئے اوربعض رسوائی اور ذلت ابدی کےلئے ۔ والخ"(دانی ایل ۱۲: ۲۰) مگر صدوقی کو قائل کرنے کیلئے ہمارے خداوند نے خروج کا بیان زیادہ پسند کیا جہاں بتایا گیا ہے کہ خدا نے فرمایا" میں ابراہام اوراضحاق اوریعقوب کا خداہوں۔ مسیح نے فرمایا " وہ تو مردوں کا خدا نہیں بلکہ زندوں کا خدا ہے"(مرقس ۱۲: ۲۷) صدوقی تو توریت کو اورسب کُتُبِ مقدسہ پر ترجیح دیتے تھے اوریہودیوں کے نزدیک دانی ایل کی کتاب نبیوں کے صحیفوں میں بھی شامل نہیں بلکہ مکتوبات میں ۔ خداوند مسیح کے اس قول کا یہ مطلب ہے کہ جب خدا آباؤں کو اپنی قربت بخش کر اُن کا خدا ہوا تو ہرگز اُن کو فنانہ ہونے دیا۔ اشیا کےلئے خالق اورسنبھالنے والا کافی ہے روحانی ہستیوں کےلئے کافی نہیں کیونکہ ایسوں کو ایک خدا کی ضرورت ہے۔

۴۔ نئے عہدنامہ کی تعلیم یہ نہیں کہ انسان کی روح بذاتہہ غیرفانی ہے کیونکہ" بقا صرف اُسی کو ہے"(۱تیمتھیس ۶: ۱۶)۔ یہ لفظ بقا (یونانی اتھنیا)تمام نئے عہدنامہ میں صرف چاربارآیا ہے اوران میں سے ایک خدا سے بقا منسوب کرتا ہے اورباقی انسان کے بقا حاصل کرنے کے بارہ میں ہیں۔ ایک اورمقام میں بقا دوسرے یونانی لفظ افتھارسیا(غیرفانی ہونا) کا ترجمہ ہے وہاں یہ بتایا جاتاہےکہ ہمارے منجی سیدنا مسیح نے بقا کو روشن کردیا۔ (۲تیمتھیس ۱: ۱۰) قیامت کے متعلق رسولوں کے عقائد نامہ میں مرقوم ہے"میں ایمان رکھتاہوں"بدن کی قیامت " پر۔ اس مشکل محاورہ کا کیا مطلب ہے؟ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو جسم دفن کیا جاتاہے پھر مادی حالت میں جی اٹھیگا کیونکہ پولوس رسول نے فرمایا کہ " گوشت اورخون خدا کی بادشاہی کے وارث نہیں ہوسکتے" (۱کرنتھیوں۱۵: ۵۰) اوریہ بھی لکھا ہے کہ جو جسم مدفون ہوتاہے وہ نہیں جو پیدا ہونے والا ہےیعنی وہ نفسانی نہیں بلکہ روحانی ہے(ایضاً ۔آیات ۳۵ سے ۴۴ تک)روحانی جسم ایسا جسم ہے جو پورے طورپر روح کی حالت کے موافق ہوا

اور روح کے حکم میں رہے۔ موجودہ مرنے والا جسم نفسانی ہے یعنی قدرتی زندگی کے موافق ہے۔ فی الحال اس جہان میں انسان جسم وروح دونوں سے مرکب ہیں اورآنے والے جہان میں روح کی ضرورتوں کے مطابق کسی قسم کے بدن اورروح سے مرکب ہوگا یعنی پوری شخصیت قائم کی جائے گی۔

نیز جنابِ مسیح نے بھی دکھایا کہ قیامت میں انسان کے جسم مادی نہ ہونگے کیونکہ وہ "آسمان پر فرشتوں کی مانند ہونگے" (مرقس ۱۲: ۲۵)۔ ہم کومعلوم نہیں کہ اورمعلوم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ شائد اس زندگی میں ہمارا معلوم کرنا ممکن نہیں کہ روحانی جسم کیا چیز ہوگی مگرہم یقین کرسکتے ہیں کہ کام کرنے ۔ خیالات ظاہر کرنے ۔ پہچاننے اورپہچانے جانے ۔ یعنی پوری شخصیت کی تمام ضرورتوں کےلئے کافی ہوگا۔(ممکن ہے کہ مسیح کے جسم سے جیسا وہ قیامت کے بعد تھا کچھ کچھ پتا چل سکتا ہے ہم کو معلوم نہیں (دیکھو لوقا ۲۴۔ یوحنا ۲۰ اوراعمال ۱: ۸)۔

مسیحی کی اُمید اورعقیدہ یہ نہیں کہ اس کی روح غیر مجسم ہوگی بلکہ یہ کہ اس کو روحانی جسم ملیگا۔ کرنتھیوں کے نام کے دوسرے خط میں بتایا گیا ہے کہ ہم کو یقین ہے کہ جب مرجائیں گے توہم کو دوسرا بدن ملیگا(باب ۵: ۱سے۸ تک)۔

۵۔ اُن گنہگاروں کا کیا حال ہوگا جوبرابر توبہ کرنے سے انکار کرتے اورخدا کی مخالفت کرتے رہیں گے؟ کیا اُن کی شخصیت سزا پاتی ہوئی ابد تک قائم رہے گی؟ کوئی شک نہیں کہ ان کو ازحد نقصان ہوگا اوران کو ابدی جہان میں سزا ملیگی پر کیا وہ ہمیشہ اسکی تکلیف اٹھاتے رہیں گے؟

جب ہم نئے عہدنامے کی تعلیم پر غورکرتے ہیں تو بعض مضمونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شریر فنا ہوجائیں گے مثلاً پولوس رسول نے لکھا" مسیح کے جی اٹھنے کی قدرت کواوراس کے ساتھ دکھوں میں شریک ہونے کومعلوم کروں اوراس کی موت سے مشابہت پیداکروں تاکہ کسی طرح مُردوں میں جی اٹھنے کےدرجہ تک پہنچوں"۔(فلپیوں ۳: ۱۰اور ۱۱) پھر کرنتھیوں کے نام کے پہلے خط کے پندرھویں باب میں شریروں کے جی اٹھنے کا ذکر نہیں(پرشاید اسکی ضرورت نہ تھی) نیز لوقا کے بیسویں باب میں یوں مندرج ہے" جو لوگ اس لائق

ٹھہرینگے اُس جہان کو حاصل کریں اورمردوں میں سے جی اٹھیں" نیز ہمارے خداوند نے گنہگار کی سزا کے بارہ میں یوں فرمایا" جہنم کے بیچ اُ س آگ میں جائے جو کبھی بجھنے کی نہیں"(مرقس ۹: ۴۳)اس میں یہ پایا جاتا ہے کہ آگ نہیں بجھے گی پر جو نتیجہ اس سے نکلتا ہے یہ ہے کہ جو اُس آگ میں جائے گا وہ بھسم ہوجائے گا۔ (آگ اورکیڑا (جونہیں مرتا)مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں)ایک اورمقام میں پولوس فرماتا ہے کہ سیدنا مسیح کی آمد آگ میں ہوگی اورجو خدا کو نہیں پہچانتے اورہمارے خداوند یسوع کی خوشخبری کو نہیں مانتے" خداوند اُن سے بدلہ لیگا۔ وہ خداوند کے چہرہ اوراُس کی قدرت کے جلال سے دورہوکر ابدی ہلاکت کی سزا پائیں گے (۲تھسلنیکیوں۱: ۸ اور۹)۔اگرہم کو پہلے سے یقین ہے کہ شریر سزا میں ہمیشہ رہیں گے توہم ہلاکت کو اسی مطلب کے موافق سمجھیں گے لیکن اگرہم یونانی آلیتھران یا اُردو لفظ کے لغاتی معنی کو مدِنظررکھیں گے تویہ نتیجہ نکالیں گے کہ شریر فنا ہوں گے پھر (دیکھوفلپیوں ۳: ۱۹) "اُن کا انجام ہلاکت ہے" کم ازکم ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ گمان کا آخر کاروہ شریر جو اپنی شرارت پر قائم رہیں گے نیست ہوں بے بنیاد نہیں۔ لیکن کلیسیا کے اکثر علما نے سکھایا کہ شریر ابدی سزا میں ابدتک رہیں گے۔ لیکن یہ عقیدہ کہ دوسرے جہان میں گنہگار کو توبہ کرنے موقع نہ ملے گا بہت مشکل سے کلام مقدس سے ثابت ہوسکتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زندگی کے کاموں کا نتیجہ قائم رہتا ہے۔ ۲۔ غیر تائیب گنہگاروں کا حال نہایت افسوسناک ہوگا۔ ۳۔ اگردوسرے جہان میں گنہگارسچ مچ توبہ کریں گے تومعافی پائیں گے کیونکہ خدا پُرمحبت اورنہایت رحیم ہے۔ اس سے زیادہ ہم کومعلوم کرنے کی ضرورت نہیں اورہم معلوم کرتے ہیں کہ جو کوئی آنے والی زندگی کو نظر اندازکرتا ہے وہ اس زندگی میں اپنی حیثیت اوراپنے فرائض کو سمجھ نہیں سکتا۔

ایک مشہور واعظ ڈاکٹر بیلارڈ صاحب مرحوم کے خادم کی موجودگی میں یہ سوال کیا گیاکہ آیا موت کے بعد توبہ اورمعافی کا امکان ہے؟ موصوف کا جواب کا یہ خلاصہ ہے کہ موت ایسی چیزنہیں جو انسان اوراس کے خالق کے تعلق میں خاص فرق پیدا کرے اورانسان کوتبدیل ہونے سے روکے۔

مگرجس بات سے خوف کھانا چاہیے یہ ہے کہ انسان کام کرتے کرتے اپنی راہوں اورخیالوں اورعادتوں میں پکا ہوجاتا ہے اورشاید مرنے کے بعدبھی وہ شخص جو زندگی میں توبہ کرنہیں سکتا ویسا ہی رہے گا۔

۶۔ چند اورمشکل باتیں ہیں جن کا پورا جواب بائبل میں نہیں ملتااورجن کو خدا نے ہم پر صاف صاف ظاہر فرمانا نہیں چاہا۔ کیا ہر انسان عرصہ درازتک عالم ارواح میں رہیگا اوراس کے بعدجی اٹھ کر اپنا روحانی جسم پائے گا اورعدالت میں آئے گا یا کیا ہرایک کی عدالت موت کے بعد ہی ہوگی؟

۲۔کیا ایماندار فوراً بہشت میں مسیح کے ساتھ رہنے کےلئے جائیں گے یا عام قیامت اورآخری دن کے بعد ؟ کیا مسیح واپس آکر ہزاربرس تک جسمانی طورپر اورعلانیہ اس جہان میں حکومت کرے گا؟ کلیسیائے جامع نے ان باتوں پر کوئی رائے قائم نہیں کی اورنہ بڑے عقائد ناموں میں اُن کا ذکر ہے۔بعض علما ایک کوپسند کرتے بعض دوسری کو۔پھر درحقیقت ایسے ایسے سوالوں کو جواب دینا اس جیسی کتاب کے مبحث کے دائرہ کے باہر ہے۔

جوہم کو صاف معلوم ہے وہ ہماری ابدی نجات کےلئے کافی ہے یعنی یہ کہ تواریخ کا خاتمہ ہوگا جب مسیح کی آمد پر وہ سب کچھ باپ کے تابع کرے گا۔ ہرانسان کی عدالت ہوگی۔ گنہگارجو مسیح پر ایمان لاتا ہے اوراپنے گناہوں سے نجات پائیگا اور ابدی خوشی اوراعلیٰ خدمت کی زندگی الٰہی قربت میں بسر کریگا۔ جوتوبہ نہ کریں گے وہ ابدی نقصان اٹھائینگے اوریہ کہ تمام دنیا کا منصف ہمارا آسمانی باپ انصاف اوررحمت کے ساتھ عدالت کرے گا اوروہ سب میں سب کچھ ہوگا۔ اورسب سے بہتر بات ایک لفظ میں ظاہر ہوتی ہے عمانوایل۔"خدا ہمارے ساتھ ہے"۔